جنگل کی ایک رات

PDFBOOKSFREE.PK

مکتبہ پیام تعلیم - جامعہ نگر - نئی دہلی ۲۵

© ریحان احمد عباسی

تقسیم کار

صدر دفتر:

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ۔ جامعہ نگر۔ نئی دہلی 110025

شاخیں:

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ۔ اردو بازار۔ دہلی 110006

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ۔ پرنسس بلڈنگ۔ بمبئی 400003

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ۔ یونی ورسٹی مارکیٹ۔ علی گڑھ 202001

دوسری بار جنوری ۱۹۹۵ء تعداد 1000 قیمت: =/6

لیزر آرٹ پرنٹرز (پروپرائٹرز مکتبہ جامعہ لمیٹڈ) پڑوری ہاؤس، دریا گنج، نئی دہلی میں طبع ہوئی

شعبۂ انگریزی
جامعہ ملّیہ اسلامیہ
نئی دہلی ۲۵

پروفیسر انور صدیقی

تعارف

ریحان احمد عباسی کو شروع سے ہی بچّوں کے ادب میں دلچسپی رہی ہے، اور انھیں بجا طور پر یہ شکایت رہی ہے کہ اردو کے لکھنے والوں نے ادب کے اس گوشے کو نظر انداز کیا ہے اور بچّوں کو دلچسپ، زندہ اور توانا ادب پاروں سے محروم رکھا ہے۔ اسی احساس کے تحت انھوں نے مکتبہ جامعہ کے بچّوں کے رسالے 'پیام تعلیم' میں ۱۹۵۲ء سے پابندی کے ساتھ لکھنا شروع کر دیا۔ انھیں جنگل کی زندگی اور اس کی تصویر کشی کا خاص ملکہ رہا ہے۔ چنانچہ ان کی بیشتر تحریروں میں جنگل اپنی تمام تر پُراسراریت کے ساتھ سانس لیتا ہے اور نظروں کے سامنے ایک طرح کا جلوۂ صد رنگ پیش کرتا ہے۔ ۱۹۵۶ء میں عباسی صاحب نے بچّوں کے لیے "جنگل کے رہنے والے" کے نام سے ایک کتاب لکھی جو دلچسپ اور معلوماتی ہونے کی وجہ سے کافی ذوق و شوق کے ساتھ پڑھی گئی۔ ۱۹۶۰ء میں بڑوں کے لیے 'شکار بیتی' شائع ہوئی جس میں شکار سے متعلق کہانیاں شامل تھی۔ اس کتاب کی بھی خاطر خواہ پذیرائی ہوئی۔ یہ بڑوں کے لیے تھی اور بڑی دلچسپی کے ساتھ پڑھی گئی۔ انھوں نے ۱۹۸۴ء میں بچّوں کے لیے 'ننھا جھبرو' کے نام سے ایک کتاب شائع کی جس پر انھیں اتر پردیش اردو اکیڈمی نے انعام سے نوازا۔

جنگل کی ایک رات اُن کا تازہ کارنامہ ہے۔ اس میں انھوں نے ایک شکار گاہ کے

Visit for more best books www.pdfbooksfree.pk

سفر اور وہاں کے مختصر سے قیام کی کہانی سنائی ہے۔ اس کہانی میں جنگل کی زندگی کے بہت سے مناظر اپنی تمام تر پُراسراریت کے ساتھ موجود ہیں۔ انھوں نے جنگلی باسیوں سے بچوں کی ملاقات کرائی ہے۔ لفظ تعارف میں نے جان بوجھ کر استعمال نہیں کیا ہے کہ وہ اکثر سرسری اور سپاٹ ہوتا ہے۔ انھوں نے جنگلی جانوروں کا صرف جلوہ ہی نہیں دکھایا ہے، بلکہ ان کی عادتوں اور خصلتوں سے بھی پڑھنے والوں کو آگاہ کیا ہے۔ جنگل کی زندگی سے متعلق ان کی معلومات کتابی اور سطحی نہیں ہیں۔ وہ بہت سی شکاری مہموں میں شریک رہے ہیں اور جنگل کی زندگی کا کھلی ہوئی آنکھوں اور ایک چوکس احساس کے ساتھ مشاہدہ کیا ہے۔ اس مشاہدے کے نقوش آپ کو اس کتاب میں جا بجا ملیں گے۔ بڑی بات یہ ہے کہ ان نقوش کو ان کے ادبی اسلوب نے زندہ کر دیا ہے۔ بچوں کی دلچسپی کی خاطر انھوں نے کتاب میں افسانوی رنگ اختیار کیا ہے، کردار سازی کی ہے، فضا آفرینی سے کام لیا ہے، مگر اس سارے عمل میں انھوں نے تخیل کو بے لگام نہیں ہونے دیا ہے۔ اپنے آپ کو اصل واقعہ سے وابستہ رکھا ہے اور اپنے سحر نگار قلم سے واقعات کے مختلف گوشوں کو منور کیا ہے۔

مجھے امید ہے کہ ان کی یہ کتاب بھی بچے شوق اور دلچسپی سے پڑھیں گے اور جنگلی جانوروں سے اپنی دلچسپی کو بڑھائیں گے بھی اور پالدار بھی کریں گے کہ یہ کتاب بظاہر ایک کہانی ہوتے ہوئے بھی حقیقت کی سرزمین میں پیوست ہے۔ میں عباسی صاحب کو اس کامیاب پیش کش پر مبارکباد دیتا ہوں۔

۹/۱۰/۸۶

جنگل کی ایک رات

شیر نے بھینس کا شکار کرنے کے لیے اپنی عادت کے مطابق اس کی گردن کو ہی نشانہ بنایا تھا، لیکن یا تو وہ بھینس کچھ زیادہ جاندار نکلی، یا پھر اتفاق سے وار ہی اوچھا پڑا۔ خیر، وجہ جو بھی رہی ہو، بھینس گری نہیں، بلکہ شیر کو لیے دیے اُس طرف سرپٹ بھاگ پڑی، جس طرف وہاں سے تھوڑے ہی فاصلے پر ایک کھلے میدان میں کچھ جھونپڑیاں پڑی ہوئی تھیں۔ شیر نے بھینس کو زمین پر گرانے کے لیے جتنے بھی داؤ آسے آتے ہوں گے، ضرور آزمائے ہوں گے، لیکن جب دیکھا کہ وہ کسی صورت چت نہیں ہو رہی ہے تو اس نے بھینس کی گردن پر سے اپنے پنجوں اور دانتوں کی گرفت ڈھیلی کی، اور جست تیزی سے اُس نے حملہ کیا تھا، اُسی تیزی اور پھرتی سے اُس نے بھاگتی ہوئی بھینس سے زمین کی طرف چھلانگ لگائی اور ایک جھاڑی کے پیچھے دیکھتے ہی دیکھتے نظروں سے اوجھل بھی ہو گیا۔

بھینس جھونپڑیوں کے پاس آکر رک گئی۔ اتفاق کی بات کہ ٹھیک اسی وقت سیّد صاحب کی جیپ بھی جنگل کے ریسٹ ہاؤس پر پہنچنے کے لیے قریب سے گزر رہی تھی، اس لیے اس بھیانک واردات کے کئی سین جیپ والوں کو بھی اپنی آنکھوں سے دیکھنے کو مل گئے۔ اور جو کچھ خود نہیں دیکھ سکے، ان کی کڑیاں تجربے اور معلومات کی بنیاد پر جوڑ کر یہ اندازہ لگا لیا کہ شیر نے کس طرح بلّی کی طرح دبے پانو آکر بھینس

Visit for more best books www.pdfbooksfree.pk

کی گردن دبوچنے کے لیے جست لگائی ہوگی اور کس طرح گردن میں جھول کر اپنے نکیلے پنجوں اور خنجر جیسے تیز دانتوں سے موٹی گردن کو توڑ ڈالنے کی کوشش کی ہوگی۔

بھینس کی گردن سے، جہاں جہاں شیر کے کیلے (نکیلے دانت) لگے تھے، وہاں سے خون رس رہا تھا، اور کمر اور گردن کے جوڑ پر بھی جہاں شیر نے اپنا پنجہ گاڑا تھا، وہاں بھی خون چھنک آیا تھا۔ اس وقت بھینس کی حالت دیکھی نہیں جا رہی تھی۔ خوف کے مارے اس کی آنکھیں اُبل پڑ رہی تھیں اور وہ انتہائی بے چینی کی حالت میں کبھی چھپنے کے لیے جھونپڑیوں کی طرف جاتی تھی، تو کبھی شاید یہ سوچ کر کہ انسانوں کے پاس زیادہ محفوظ رہے گی، وہ جیپ کے پاس چلی آتی تھی، جہاں اس وقت تک ان جھونپڑیوں کے رہنے والے بھی آکر جمع ہونے لگے تھے۔

اور پھر —— لیکن ٹھہریے۔ اس قصّے کو درمیان سے بتانے کی بجائے میرے خیال سے یہ زیادہ اچھا رہے گا کہ اسے شروع سے سنایا جائے، تاکہ کہانی کا منظر اور پس منظر سبھی کچھ سامنے آجائے اور ساتھ ہی پڑھنے والے کو یہ بھی معلوم ہو جائے کہ کن حالات اور کس ماحول میں یہ واقعہ پیش آیا۔

یہ قصّہ دراصل اُس رات سے شروع ہوتا ہے جب سیّد صاحب لگ بھگ جاگتے ہی رہے تھے۔ وہ کبھی داہنی کروٹ بدلتے تھے اور کبھی بائیں۔ کبھی ایک ہاتھ سر کے نیچے رکھتے تھے اور کبھی دوسرا۔ کبھی تکیے کی پوزیشن بدلتے تھے اور کبھی خود اپنی۔ لیکن نیند نے تو اس رات جیسے نہ آنے کی قسم کھالی تھی اور ایسی روٹھی تھی کہ کسی طور بہلائے نہیں بہل رہی تھی۔ مزے کی بات یہ تھی کہ نیند کے نہ آنے میں خود سیّد صاحب کے ارادے کا کوئی دخل نہیں تھا، بلکہ وہ تو خدا سے چاہ رہے تھے کہ کسی طرح نیند آجائے اور دماغ میں جو اُتھل پتھل مچی ہے، اُسے چین ملے۔ اسی لیے نیند کو بلانے کے لیے وہ کئی بار دل میں یہ ٹھان کر لیٹے کہ میں اَب کوئی بات نہیں سوچوں گا اور ذہن کو خالی رکھ کر نیند یا کو اپنے پنکھ پھیلانے کا موقع دوں گا۔ لیکن یہ کوششیں بھی ناکام رہیں اور اُن کا بے لگام ذہن اگلے چند دنوں میں پیش آنے والے واقعات کی مَن پسند خیالی تصویریں پیش کر کے انھیں مسلسل سوچتے رہنے پر مجبور کرتا رہا۔

سچ پوچھیے تو اس طرح کی صورتِ حال پیدا ہو جانے میں قصور کسی اور کا نہیں، خود سیّد صاحب کی اپنی طبیعت اور شوق کا تھا، کیوں کہ ان کی یہ کیفیت اسی وقت سے شروع ہو گئی تھی جب رشام انھیں یہ بتایا گیا تھا کہ شکار پر وہ بھی ساتھ جا رہے ہیں۔ ظاہر ہے اس نوید کے بعد انھیں ہاگی، شیر، گلدار، ریچھ، سانبھر، چیتل، نیل گائے، اور پاڑے جیسے جانوروں کا خیال تو آنا ہی تھا جنھیں اپنے قدرتی انداز میں زندگی بسر کرتے ہوئے ایک دوسرے کے پیچھے لپکتے جھپٹتے اور بھاگتے دوڑتے جنگلوں میں ہی دیکھا جا سکتا ہے —— صرف گھنے جنگلوں میں۔

شکار پر جانے کی باتیں گھر میں کئی دن سے چل رہی تھیں۔ سیّد صاحب دیکھ رہے تھے کہ ابّو اور چچا جان کو دن ہو یا رات، جب بھی ایک ساتھ بیٹھنے کا موقع ملتا، وہ اسی کی باتیں لے بیٹھتے، اور شام کے وقت جب ان کے دوست احباب بھی دن بھر کے اپنے اپنے کاموں سے فارغ ہو کر آجاتے تو ان کے گھر میں اچھی خاصی شکار کانفرنس ہو جاتی۔ روانگی کا کون سا وقت مناسب رہے گا، ساتھ جانے والا سامان کیسا اور کتنا ہو، واپسی کب ہونی چاہیے —— غرض اس طرح کے سوالات اُٹھا کر ان کے ہر ہر پہلو پر غور کیا جاتا۔ جنگل میں بازار ہاٹ تو ہوتے نہیں، اس لیے سب کا زور اسی بات پر رہتا کہ ضرورت کی سبھی چیزیں مناسب مقدار اور تعداد میں ساتھ رہیں تاکہ وہاں کسی بات کی تکلیف یا کمی محسوس نہ ہو۔ یہ نصیحت تو سب ہی ایک دوسرے کو کرتے کہ ہر کوئی اپنے ساتھ دوسری چیزوں کے علاوہ چاقو اور ٹارچ ضرور رکھے کیوں کہ جنگل میں ان کی ضرورت پڑا ہی کرتی ہے۔

روانگی سے ایک دن پہلے جب ساتھ جانے والا سامان اکٹھا کیا جا رہا تھا تو سیّد صاحب نے خوب دوڑ دوڑ کر کام کیا۔ وہ کبھی ابّو اور چچا جان کے پہننے اوڑھنے کے کپڑے جمع کرتے ہوئے نظر آئے تو کبھی ملازم کی مدد سے بیٹھنے اٹھنے کے لیے دری چاندنیاں اور دوسرا سامان جمع کرتے دکھائی دیے۔ اور شاید اسی بات نے اُن کی بات بنا دی اور یہ جانتے ہوئے کہ سیّد کو بھی اپنے بڑوں کے مقابلے جنگل اور جنگل کے جانوروں سے کچھ کم لگاؤ اور دلچسپی نہیں ہے، انھیں بھی ساتھ لے چلنے کا فیصلہ کر لیا گیا۔

وہ مئی کی ۲۶ تاریخ تھی جب رات میں کوئی دو ڈھائی بجے کوچ کی تیاریاں شروع ہوئیں

Visit for more best books www.pdfbooksfree.pk

سفر اور وہاں کے مختصر سے قیام کی کہانی سنائی ہے۔ اس کہانی میں جنگل کی زندگی کے بہت سے مناظر اپنی تمام تر پُراسراریت کے ساتھ موجود ہیں۔ انھوں نے جنگل باسیوں سے بچوں کی ملاقات کرائی ہے۔ لفظ تعارف میں نے جان بوجھ کر استعمال نہیں کیا ہے کہ وہ اکثر سرسری اور سپاٹ ہوتا ہے۔ انھوں نے جنگلی جانوروں کا صرف جلوہ ہی نہیں دکھایا ہے، بلکہ ان کی عادتوں اور خصلتوں سے بھی پڑھنے والوں کو آگاہ کیا ہے۔ جنگل کی زندگی سے متعلق ان کی معلومات کتابی اور سطحی نہیں ہیں۔ وہ بہت سی شکاری مہموں میں شریک رہے ہیں اور جنگل کی زندگی کا کھلی ہوئی آنکھوں اور ایک چوکس احساس کے ساتھ مشاہدہ کیا ہے۔ اس مشاہدے کے نقوش آپ کو اس کتاب میں جا بجا ملیں گے۔ بڑی بات یہ ہے کہ ان نقوش کو ان کے ادبی اسلوب نے زندہ کر دیا ہے۔ بچوں کی دلچسپی کی خاطر انھوں نے کتاب میں افسانوی رنگ اختیار کیا ہے، کردار سازی کی ہے، فضا آفرینی سے کام لیا ہے، مگر اس سارے عمل میں انھوں نے تخیل کو بے لگام نہیں ہونے دیا ہے۔ اپنے آپ کو اصل واقعہ سے وابستہ رکھا ہے اور اپنے سحر نگار قلم سے واقعات کے مختلف گوشوں کو منور کیا ہے۔

مجھے امید ہے کہ ان کی یہ کتاب بھی بچے شوق اور دلچسپی سے پڑھیں گے اور جنگلی جانوروں سے اپنی دلچسپی کو بڑھائیں گے بھی اور پائدار بھی کریں گے کہ یہ کتاب بظاہر ایک کہانی ہوتے ہوئے بھی حقیقت کی سرزمین میں پیوست ہے۔ میں عباسی صاحب کو اس کامیاب پیش کش پر مبارکباد دیتا ہوں۔

۹/۱۰/۸۶

جنگل کی ایک رات

شیر نے بھینس کا شکار کرنے کے لیے اپنی عادت کے مطابق اس کی گردن کو ہی نشانہ بنایا تھا، لیکن یا تو وہ بھینس کچھ زیادہ جاندار نکلی، یا پھر اتفاق سے وار ہی اوچھا پڑا۔ خیر، وجہ جو بھی رہی ہو، بھینس گری نہیں، بلکہ شیر کو لیے لیے اُس طرف سرپٹ بھاگ پڑی، جس طرف وہاں سے تھوڑے ہی فاصلے پر ایک کھلے میدان میں کچھ جھونپڑیاں بڑی ہوئی تھیں۔ شیر نے بھینس کو زمین پر گرانے کے لیے جتنے بھی داؤ اُسے آتے ہوں گے، ضرور آزمائے ہوں گے، لیکن جب دیکھا کہ وہ کسی صورت چت نہیں ہو رہی ہے، تو اس نے بھینس کی گردن پر سے اپنے پنجوں اور دانتوں کی گرفت ڈھیلی کی، اور جس تیزی سے اُس نے حملہ کیا تھا، اُسی تیزی اور پھرتی سے اُس نے بھاگتی ہوئی بھینس سے زمین کی طرف چھلانگ لگائی اور ایک جھاڑی کے پیچھے دیکھتے ہی دیکھتے نظروں سے اوجھل بھی ہو گیا۔

بھینس جھونپڑیوں کے پاس آکر رک گئی۔ اتفاق کی بات کہ ٹھیک اسی وقت سیّد صاحب کی جیپ بھی جنگل کے ریسٹ ہاؤس پر پہنچنے کے لیے قریب سے گزر رہی تھی، اس لیے اس بھیانک واردات کے کئی سین جیپ والوں کو بھی اپنی آنکھوں سے دیکھنے کو مل گئے۔ اور جو کچھ خود نہیں دیکھ سکے، ان کی کڑیاں تجربے اور معلومات کی بنیاد پر جوڑ کر یہ اندازہ لگا لیا کہ شیر نے کس طرح بلی کی طرح دبے پاؤں آکر بھینس

Visit for more best books www.pdfbooksfree.pk

اتفاق سے کچھ ہی دیر پہلے سیّد بھی اپنی کوششوں میں کامیاب ہو گئے تھے اور ان کی آنکھ لگ گئی تھی اس لیے کچھ دیر تو انھیں پتا نہ چلا اور وہ بے خبر پڑے ہلکے ہلکے خرّاٹے لیتے رہے۔ مگر جب گھر میں چہل پہل بڑھی اور سامان رکھنے رکھانے اور اُسے اِدھر سے اُدھر کرنے میں آوازیں ہوئیں تو اُن کی آنکھ کھُل گئی۔ وہ ہڑبڑا کر اُٹھ بیٹھے اور یہ سوچتے ہوئے کہ کہیں میں پھسڈی نہ رہ جاؤں، جھٹ پٹ ہاتھ منہ دھو، کپڑے تبدیل کر، سب سے پہلے تیار ہو کر اکیلے ہی جیپ میں آبیٹھے۔

سیّد کو یوں تو اپنی زندگی میں متعدد بار اسی طرح اتنے سویرے اٹھنے کا موقع مل چکا تھا لیکن یہ صبح انھیں اور دنوں کے مقابلے کہیں زیادہ حسین اور سہانی معلوم ہوئی۔ اس وقت دن کی طرح لُو نہیں چل رہی تھی، پھر بھی ہوا ایسی نہ تھی جسے ٹھنڈی کہا جا سکتا۔ موسم کی اتنی تبدیلی بھی انھیں بڑی خوش گوار اور فرحت افزا معلوم ہو رہی تھی۔ اس وقت قریب کے باغیچے سے شیاما (بُھجنگی، چیل جھانپو) کے بولنے کی آوازیں آ رہی تھیں۔ انھیں یاد آیا کہ لمبی دُم والی کوّے کی طرح گہرے سیاہ رنگ کی شیاما سب سے پہلے بیدار ہو جانے والی چڑیوں میں سے ہے جو سورج نکلنے سے دو تین گھنٹے پہلے ہی سے بولنا شروع کر دیتی ہے۔

سیّد کو وہ بات بھی یاد آئی جب انھیں پچھلے سال شروع برسات میں اتفاقاً شیاما کے ایک گھونسلے کا پتا چل گیا تھا، لیکن کوشش کے باوجود گھونسلے تک ان کی رسائی نہ ہو سکی تھی۔ ہُوا یہ تھا کہ ایک دن جب وہ اپنے باغیچے میں چہل قدمی کر رہے تھے تو انھوں نے دیکھا کہ گوریّوں سے کچھ بڑی دو کالی چڑیاں، جن کی دُمیں لمبی اور سِرے پر اندر کی طرف انگریزی کے حرف A کی طرح کٹی ہوئی ہیں، چھوٹے چھوٹے تنکے بین کر بیری کے ایک گھنے پیڑ میں لے جا کر رکھ رہی ہیں۔ سیّد سمجھ گئے کہ ہو نہ ہو، یہ چڑیاں شیاما ہیں جو انڈے دینے کے لیے گھونسلہ تیار کر رہی ہیں۔ سیّد نے سوچا کہ شیاما کے گھونسلے کی بات وہ کسی اور کو نہیں

بتائیں گے۔ ہو سکتا ہے کوئی شریر لڑکا انڈے نکال کر گھونسلہ برباد کر دے اور کسی کا گھر اُجاڑنے کا گناہ خواہ مخواہ ان کے سر پڑے۔ لیکن جب کچھ دیر بعد ان کی ملاقات اپنے دوست محسن سے ہوئی تو اُن سے نہ رہا گیا اور اپنی احتیاط کو بالائے طاق رکھ، شیاما کے گھونسلے کی بات اسے بتا دی۔

سیّد کی طرح محسن بھی جانوروں کے شیدائی تھے۔ یہ خبر سنتے ہی اُچھل پڑے اور لگے منصوبے بنانے۔ دونوں دوستوں نے عہد کیا کہ اب کسی اور کو اس راز میں شریک نہیں کریں گے اور خود گھونسلے کا ذرا قریب سے مشاہدہ کر کے دیکھیں گے کہ شیاما نے کتنے انڈے دیے ہیں، وہ کتنے بڑے ہیں اور ان کا رنگ کیسا ہے۔

شیاما جوڑے نے اپنا گھونسلہ تیار کرنے میں دو دن سے زیادہ وقت نہیں لگایا۔ لگاتار چار پانچ دن تک دونوں دوستوں نے اپنا زیادہ سے زیادہ وقت بیری کے پیڑ کے آس پاس رہ کر ہی گزارا۔ جب انھوں نے دیکھ لیا کہ تنکے بین کر گھونسلے میں رکھنے کا سلسلہ بند ہو چکا ہے اور صرف ایک ہی چڑیا دکھائی دے رہی ہے تو وہ سمجھ گئے کہ مادہ شیاما نے انڈے دے کر انھیں سینا شروع کر دیا ہے۔ پروگرام بنا کہ جب دوپہر میں گھر والے آرام کر رہے ہوں، اُس وقت اطمینان سے گھونسلے تک پہنچنے کی کوشش کی جائے۔ دوپہر آئی اور جب تیز دھوپ سے گھبرا کر چرندے پرندے بھی سایہ ڈھونڈنے لگے تو دونوں دوست گری سے بے پروا دبے پاؤں باغیچے میں جا پہنچے۔ لیکن جب پیڑ کی جڑ کے پاس کھڑے ہو کر اوپر نگاہ ڈالی تو انھیں اپنے خوابوں کے محل چکنا چور ہوتے دکھائی دیے۔ شیاما نے اپنا گھونسلہ ایسی جگہ بنایا تھا جہاں ٹہنیاں پتلی پتلی اور نرم تھیں، اور وہاں تک پیڑوں پر چڑھنے کے عام انداز میں پہنچا ہی نہیں جا سکتا تھا۔ اور اگر سیڑھی کی مدد لی جاتی، تب بھی گھونسلے تک سَر لے جانا تو بڑی بات، ہاتھ بھی نہیں ڈالا جا سکتا تھا کیوں کہ بیری کی کانٹے دار ٹہنیاں وہاں اور بھی گھنی ہو گئی تھیں۔

اس صورت حال نے دونوں کو بوکھلا دیا۔ اُن کے منہ اُتر گئے اور وہ ایک لفظ بولے بغیر بوجھل بوجھل قدموں سے گھروں کو لوٹ گئے۔ اتفاق سے دونوں دوست ایک ساتھ اور ایک ہی ماسٹر صاحب سے ٹیوشن پڑھتے تھے۔ شام کو جب ماسٹر صاحب پڑھانے کے لیے

Visit for more best books www.pdfbooksfree.pk

آئے تو ان کے چہرے دیکھ کر گھبرا گئے کہ کچھ دال میں کالا ہے۔ وہ سمجھے کہ دونوں دوستوں میں کسی بات پر کہا سُنی ہو گئی ہے، تبھی وہ منہ لٹکائے خاموش اور اُداس بیٹھے ہوئے ہیں۔ لیکن جب پوچھنے پر حقیقت سامنے آئی تو انھوں نے دونوں کی دِل جوئی کے لیے اُس دن معمول کی پڑھائی ملتوی کر کے، شیاما کی باتیں بتانا شروع کر دیں۔

ماسٹر صاحب نے بتایا کہ چڑیاں بڑی حساس ہوتی ہیں۔ یہ اچھا ہی ہُوا کہ گھونسلے تک کسی کا ہاتھ نہیں پہنچا۔ اگر شیاما کے انڈے چھو کر دیکھ لیے جاتے تو ہو سکتا تھا کہ چھونے والے کے ہاتھ کی بُو باس ان میں سما جاتی۔ اگر ایسا ہوتا تو پھر شیاما انڈوں کو سینا چھوڑ دیتی اور وہ برباد ہو جاتے۔ ماسٹر صاحب نے یہ بھی بتایا کہ مادہ شیاما عموماً ایک جھول میں چار انڈے دیتی ہے۔ اس کے انڈے بھی گوریّوں کے انڈوں جیسے ننھے ننھے ہوتے ہیں اور ان پر ہلکے کاہی رنگ کی باریک باریک چتّیاں پڑی ہوتی ہیں۔ جب بچے نکل آتے ہیں تو شیاما شروع میں مچھروں جیسے ننھے ننھے کیڑے اور بھنگے پکڑ پکڑ کر کھلاتی ہے اور بڑے ہونے پر دھیرے دھیرے بڑے کیڑوں سے ان کا پوٹا بھرتی ہے۔ شیاما کے بچے بھی گوریّوں کے بچّوں کی طرح بڑے پیٹو ہوتے ہیں۔ وہ ماں باپ کو دن بھر چین نہیں لینے دیتے اور ہر وقت منہ پھاڑے کھانے کا مطالبہ کرتے رہتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ وہ بڑی تیزی سے پروان چڑھتے اور دیکھتے ہی دیکھتے پندرہ بیس دن میں اُڑنے کے قابل ہو جاتے ہیں۔

سیّد اپنی سوچوں میں گُم تھے۔ ممکن تھا کہ ان کے ذہن کے خیالی پردے پر ایک فلم کی طرح کچھ اور گزری

ہوئی باتیں اُبھرتیں، لیکن ان کا نام لے کر پکاری جانے والی ایک تیز آواز نے انھیں چونکا دیا۔ سیّد نے دیکھا کہ اس دوران، جبکہ ان کا ذہن شیاما کی یادیں سمیٹنے میں محو تھا، جیپ میں نہ صرف ساتھ جانے والا سامان رکھا جا چکا ہے، بلکہ اس کے ابّو، چچا جان اور ان کے شکاری دوست، جنھیں وہ ان کے ناموں کے ساتھ چچا، لفظ کا اضافہ کر کے مخاطب کرتے تھے، اس میں آ آ کر بیٹھنے لگے ہیں۔

کچھ ہی دیر میں وہ وقت بھی آ گیا جس کا شدّت سے انتظار تھا۔ سفر شروع ہوا اور جیپ تیزی سے منزلیں سر کرنے میں لگ گئی۔ اپنے شہر سے کہیں دور جانے کا ان کا یہ پہلا موقع تھا اس لیے وہ آس پاس کی ایک ایک چیز کو بڑے شوق اور انہماک سے دیکھتے جا رہے تھے۔ شروع شروع میں تو اندھیرے کی وجہ سے کچھ دقّت رہی، لیکن پوری طرح سورج نکل آنے پر جب ہر چیز روشنی میں نہا گئی تو آگے پیچھے اور دائیں بائیں، دور دور تک نگاہ کام کرنے لگی۔ ان کی نظریں کبھی سڑک کے آس پاس پڑنے والی آبادیوں اور اُن میں گھومتے پھرتے بچّوں اور بڑوں کا جائزہ لیتیں، تو کبھی حدِّ نگاہ تک پھیلے کھیتوں اور ان میں کام کرتے کسان اور عورتوں پر جا کر رُک جاتیں۔ کبھی وہ سڑک کے کناروں پر لگے بورڈ اور ٹریفک اشارے پڑھنے میں لگتیں تو کبھی یہ جاننے کے لیے کہ اب تک کتنا سفر طے ہو چکا ہے، میل کے پتھر تلاش کرنے میں مصروف ہو جاتیں۔ کبھی وہ راستے میں پڑنے والے ندی نالوں کو دلچسپی سے دیکھتیں، تو کبھی حسرت سے ان میں نہانے والوں کو۔

راستے بھر جیپ سوار آپس میں باتیں کرتے رہے۔ ادبی، سماجی، تہذیبی، مذہبی اور تاریخی —— ہر طرح کی باتیں ہوئیں۔ بیچ بیچ میں شعر و شاعری، لطیفے اور فقرے بازی بھی ہوتی رہی۔ بات میں سے بات نکلتی، اور اکثر یہی ہوتا کہ کسی سنجیدہ موضوع پر شروع کی گئی بات چیت کی تان، کسی لطیفے پر جا کر ٹوٹتی۔ جیپ جب کسی قابلِ ذکر شہر یا قصبے سے ہو کر گزر رہی ہوتی تو اس کے بارے میں بھی تھوڑی بہت باتیں ہو جاتیں، اور تب ہر کسی کی کوشش یہی ہوتی کہ وہ بھی اس کے بارے میں کچھ بتا کر اپنی معلومات کا سکّہ جمائے۔ ایسے وقت سیّد بھی ان کی طرف متوجہ ہو جاتے اور ان کے کانوں میں ایک ساتھ مختلف اور بے ترتیب

Visit for more best books www.pdfbooksfree.pk

آوازیں پڑنا شروع ہو جاتیں، جو کچھ اس طرح ہوتیں:

"لیجیے غازی آباد آگیا۔ یوپی کا ایک بڑا صنعتی شہر جہاں چھوٹی بڑی ہزاروں فیکٹریاں اور کارخانے قائم ہیں۔ کوئی ایک گھنٹہ لگا یہاں تک پہنچنے میں۔ یہ بھی دہلی کی طرح پھیلتا ہی جا رہا ہے ——"

"ڈاسنہ —— یہاں سے صبح شام ہزاروں لیٹر دودھ دہلی جاتا ہے۔ یہاں دہلی ملک اسکیم کا پلانٹ لگا ہے جہاں دودھ کو پہلے ایک خاص درجۂ حرارت تک اُبالا جاتا ہے، پھر برف کی طرح ٹھنڈا کر کے اُسے دودھ گاڑیوں میں بھر کر روانہ کر دیا جاتا ہے —— ڈاسنہ کے قریب ایک بڑی جھیل بھی ہے۔ جاڑوں میں مرغابیوں کے شکار کے لیے دور دور سے شکاری یہاں آتے ہیں ——"

"یہ پلکھوا ہے —— ہینڈلوم کپڑے تیار کرنے کا ایک بڑا مرکز۔ یہاں سے روزانہ لاکھوں روپوں کا کپڑا باہر جاتا ہے ——"

"لو بھئی، ہاپڑ شروع ہو گیا —— ہاپڑ کے پاپڑ —— یہ اناج اور گُڑ کی بہت بڑی منڈی ہے۔ اب تو یہاں بھی بہت سے چھوٹے بڑے کارخانے کھل گئے ہیں۔ اس شہر کو ایک اعزاز یہ بھی حاصل ہے کہ بابائے اُردو مولوی عبدالحق یہیں پیدا ہوئے تھے ——"

"یہ سنبھاولی ہے، جہاں چینی تیار کرنے کی بہت بڑی مِل ہے ——"

"لیجیے گنگا کا پُل آگیا۔ گڑھ مکتیشور کا گھاٹ —— گنگا کے کنارے آباد یہ قصبہ ایک تیرتھ استھان کی حیثیت رکھتا ہے۔ ہندی مہینے 'کارتک' کی پورن ماشی پر، جو عموماً نومبر کے تیسرے چوتھے ہفتے میں پڑتی ہے، یہاں ہر سال نہان کا میلہ لگتا ہے۔ دور دور سے آکر ہزاروں کی تعداد میں لوگ یہاں جمع ہو جاتے ہیں۔ اس دن گنگا میں نہانا بڑے پُن (ثواب) کی بات سمجھی جاتی ہے۔ کارتک مہینے کی پورن ماشی، یعنی جب رات کو پورا چاند نکلا ہوتا ہے، صرف ہندوؤں میں نہیں، سکھوں میں بھی بڑی اہمیت رکھتی ہے۔ سکھ مذہب کے بانی اور پہلے گورو، بابا نانک اسی دن پیدا ہوئے تھے ——"

"گجرولہ آگیا —— دہلی مراد آباد شاہراہ کے قریب آباد ایک مشہور قصبہ،

لمبے سفر والی موٹر گاڑیاں، ٹرک اور بسیں تازہ دم ہونے کے لیے عموماً یہاں رُکا کرتی ہیں۔ یہیں سے حسن پور اور بجنور کو بھی سڑکیں جاتی ہیں —— اور جناب، اب ہمیں بھی تو بجنور والی سڑک پر مُڑنا ہوگا۔ ہماری منزل بھی تو اسی طرف ہے ——"

سیّد اگرچہ اس سفر میں شروع ہی سے ساتھ تھے اور چلنے سے پہلے کی میٹنگوں میں کبھی کبھار بڑوں کے پاس بیٹھ کر باتیں سننے کا موقع انھیں مل چکا تھا، لیکن یہ عجب بات تھی کہ انھیں اس جگہ کا نام ابھی تک نہیں معلوم ہو سکا تھا جہاں وہ جا رہے تھے۔ دراصل انھوں نے اس کی پروا بھی نہ کی تھی۔ ان کے نزدیک پیٹر گننے کے بجائے آم کھانے کی زیادہ اہمیت تھی اور ان کے لیے اتنا جاننا ہی بہت تھا کہ وہ کسی ریزرو فارسٹ میں جا رہے ہیں، یعنی ایسے محفوظ جنگل میں جہاں صرف وہی لوگ شکار کے لیے جا سکتے ہیں، جنھیں جنگلی جانوروں سے متعلق سرکاری محکمہ ایک مخصوص مدّت کے لیے شکار کھیلنے کا پرمٹ دیتا ہے، اور وہ بھی سیزن یا موسم کے لحاظ سے محض چند مقرّرہ پرندوں اور جانوروں کے لیے۔ لیکن جب ان کے کانوں میں محبوب چچا کی وہ بات پڑی جس میں انھوں نے عادت کے مطابق اپنا تکیہ کلام 'جناب' بھی استعمال کیا تھا، تو ان کی دبی ہوئی خواہش جاگ اٹھی۔ اُن کا جی چاہا کہ کاش اب سفر کے بزرگ ساتھی آپس میں اس جگہ کی باتیں کرنے لگیں جس سے انھیں بھی معلوم ہو جائے کہ جہاں جا رہے ہیں اس کا نام کیا ہے اور وہاں کون کون سے جانور مل سکتے ہیں۔ سیّد بڑی اُمیدوں سے کافی دیر تک ان لوگوں کی باتوں پر کان لگائے رہے، لیکن جب دیکھا کہ وہ بدستور اِدھر اُدھر کی باتوں میں لگے ہیں تو انھوں نے بیزار ہو کر اپنی توجّہ ان کی طرف سے ہٹا لی اور پہلے کی طرح ایک بار پھر ان کی نگاہیں بھاگتے ہوئے مناظر سے لُطف لینے لگیں۔

گجرولہ کے بعد راستے میں دھنورہ، شیر کوٹ، چاند پور، بجنور اور نجیب آباد، کئی چھوٹے بڑے شہر، قصبے اور گاؤں پڑے، لیکن کہیں رُکے نہیں۔ رُکنے کا مطلب تھا جنگل کے روح پرور مناظر کی سیر میں اتنی ہی دیر کی تاخیر اور کمی۔ یہ کھُلا نقصان بھلا کیوں منظور ہوتا، اس لیے بغیر رُکے آگے ہی آگے بڑھتے چلے گئے۔ البتہ اس دوران سیّد کو جبّار چچا کی باتوں سے نہ صرف اس بلاک کا نام معلوم ہو گیا، بلکہ یہ بھی پتا چل گیا کہ شکار کا پرمٹ ان کے جس دوست کے

Visit for more best books www.pdfbooksfree.pk

نام ہے وہ دو دن پہلے ہی جنگل میں پہنچ چکے ہیں۔

نجیب آباد کے بعد راستے میں جو آخری آبادی پڑی، اس کا نام تھا بڑھاپور۔ بڑھاپور دراصل ایک بڑا گانو ہے جو پہاڑی نما اونچے نیچے ٹیلوں پر آباد ہے۔ اور پھر بڑھاپور کی آبادی ختم ہوتے ہی، جیسا کہ اپنے ملک کے ہر چھوٹے بڑے شہر، گانو اور قصبے میں ہوتا ہے، یہاں بھی کھیت کھلیانوں اور باغ بغیچوں کا سلسلہ شروع ہو گیا جو دور تک پھیلا ہوا تھا۔

جیپ جب کھیتوں کے درمیان بنی ایک کچی سڑک سے گزر رہی تھی تو راستے میں ایک جگہ سڑک سے تھوڑا ہٹ کر چار دیہاتی نوجوان کتوں کے ساتھ گھومتے ہوئے دکھائی دیے۔ اس وقت ان میں سے دو نے الگ الگ دو انتہائی دبلے پتلے اونچے قد کے کتے تھام رکھے تھے، جبکہ باقی دو، لکڑیوں سے ان جھاڑیوں کو پیٹنے میں لگے تھے جو کھیتوں کی منڈیروں پر یا کہیں کہیں درمیان میں اُگ آئی تھیں۔ ان اجنبی نوجوانوں میں نہ جانے ایسی کیا بات نظر آئی کہ فوراً جیپ روک لی گئی سیّد کو یہ بات کچھ عجیب سی لگی۔ لیکن جلد ہی اس کی وجہ معلوم ہو گئی اور وہ بھی دلچسپی سے ان کی طرف دیکھنے لگے۔ پتا چلا کہ یہ لوگ کتوں سے خرگوش کا شکار کر رہے ہیں اور دبلے پتلے کتے، جو دیکھنے میں ہڈیوں کا ڈھانچہ اور فاقوں کے مارے دکھائی دے رہے ہیں، چھریرے بدن کے ہی ہوتے ہیں۔ اس نسل کے کتوں کو تازی، لانچ، یا گرے ہاؤنڈ کہا جاتا ہے۔ یہ کتے نہایت پھرتیلے، چست اور انتہائی تیز دوڑنے والے ہوتے ہیں۔

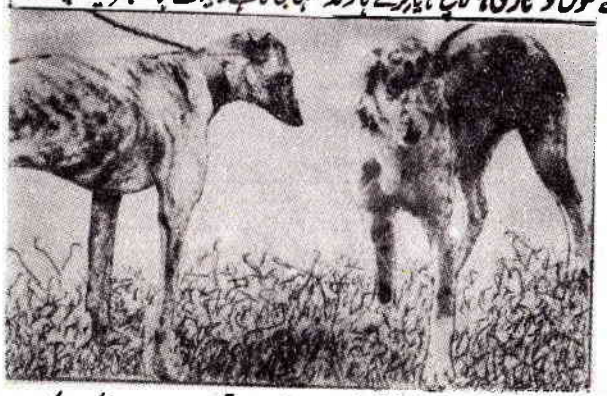

فیضی چچا، سیّد کو تازی نسل کے کتوں کے بارے میں یہ باتیں بتا ہی رہے تھے کہ اچانک

جھاڑیاں پیٹنے والے ایک نوجوان نے ایک زوردار آواز لگائی ــــ "پکڑ ــــ یہ گیا ــــ"

سیّد نے دیکھا کہ جس جھاڑی کے پاس نوجوان نے آواز لگائی تھی، وہاں سے بھورے رنگ کا ایک موٹا تازہ خرگوش نکل کر نہایت تیزی سے کھیت میں دوڑا جا رہا ہے "ــــ پکڑ ــــ یہ گیا ــــ" کی آواز کتوں کے کانوں میں کیا پڑی کہ وہ آپے سے باہر ہو گئے

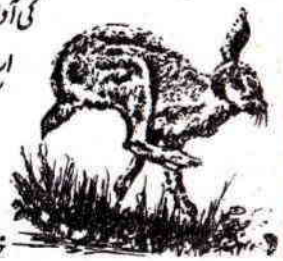

اب نہ جانے ان کے اُچھلنے سے جھٹکا لگا، یا جان بوجھ کر رسّیوں کے سرے ہاتھ سے چھوڑے گئے، ہُوا یہ کہ دونوں کتوں کی گردنوں میں پڑے پٹوں سے رسیاں نکل گئیں، اور وہ آندھی طوفان کی طرح قلانچیں بھرتے خرگوش کے پیچھے دوڑ پڑے۔

خرگوش کے جھاڑی سے نکلنے اور اُس پر کتوں کے جھپٹنے کا عمل آناً فاناً اور تقریباً ایک ہی وقت میں ہُوا۔ لیکن اس کے باوجود جب کتے مقابلے کی دوڑ میں شریک ہونے کے لیے میدان میں اُترے تو شکار اور شکاریوں کے درمیان بیس پچیس گز کا فاصلہ ہو چکا تھا۔ جس لمبے چوڑے کھیت میں یہ مقابلہ شروع ہوا، اس میں کوئی فصل اگی ہوئی نہ تھی، اس لیے اس خونیں دوڑ کا پورا منظر بغیر کسی رکاوٹ کے صاف دکھائی دے رہا تھا۔ سیّد نے دیکھا کہ خرگوش کے دوڑنے کا انداز کچھ ایسا ہے جیسے کوئی گیند ٹپّے کھاتی جا رہی ہو۔ گیند کے ٹپّے کھانے کی مثال اس لیے بھی ذہن میں آئی کیونکہ خرگوش اس وقت ہرن کی طرح لمبی لمبی چھلانگیں لگاتا ہوا دوڑ رہا تھا۔ وہ ناک کی سیدھ میں دوڑنے کے بجائے ہر چھلانگ کے بعد دائیں بائیں رُخ بھی بدلتا جا رہا تھا۔ ادھر کتوں کو دیکھ کر ایسا لگ رہا تھا جیسے ان کی ٹانگیں غائب ہو گئی ہیں اور ان کی جگہ جسم میں پہیّے لگ گئے ہیں، اور وہ زمین سے چپکے چپکے کسی موٹر سائیکل کی طرح انتہائی تیزی سے آگے ہی آگے بڑھتے جا رہے ہیں۔

خرگوش کی برق رفتاری کوئی سو گز تک بنی رہی۔ اس دوران کتوں اور اس کے درمیان کا فاصلہ اگر بڑھا نہیں تو کوئی خاص کم بھی نہیں ہُوا۔ لیکن اس کے بعد شاید اس کی ٹانگیں جواب دینے لگیں اور رفتار میں ایک دم نمایاں فرق آ گیا۔ اور پھر ــــ شاید سیّد نے ایک آدھ

Visit for more best books www.pdfbooksfree.pk

باری پلکیں جھپکائی ہوں گی کہ دیکھتے ہی دیکھتے شکار اور شکاریوں کے درمیان فاصلہ کم ہو گیا اور پھر جبکہ خرگوش کو کھیت کے دوسرے کنارے پر اُگی ایک گھنی جھاڑی تک پہنچنے میں بس دو چار ہاتھ کا ہی فاصلہ رہ گیا تھا، کہ ان میں سے ایک کتے نے، جو اپنے ساتھی سے چند قدم آگے آ چکا تھا، لپک کر اُچھلتے ہوئے خرگوش کو ہوا میں ہی دبوچ لیا۔

اگرچہ وہ چاروں نوجوان بھی کتوں کے ساتھ ہی خرگوش کی طرف لپکے تھے، مگر دوڑ میں وہ چونکہ کتوں کی برابری نہیں کر سکتے تھے، اس لیے جب خرگوش کو دبوچ لیا گیا، اس وقت وہ وہاں سے کافی پیچھے تھے۔ لیکن کتے اتنے سدھے ہوئے نکلے کہ انھوں نے خرگوش کو پکڑ کر ایک جھٹکا تو دیا، مگر اسے بھنبھوڑا نہیں۔ کتے، خرگوش کو بے سدھ زمین پر ڈال کر اس کے قریب کھڑے ہو گئے اور اپنے مالکوں کی طرف دیکھنے لگے جو ان کے نام پکارتے ہوئے دوڑے چلے آ رہے تھے۔ اس وقت دونوں کتے بُری طرح ہانپ رہے تھے اور ان کی لال لال زبانیں منہ سے نکلی پڑ رہی تھیں۔ پھر ایک منٹ یا شاید اس سے بھی کم وقت لگا ہوگا کہ وہ چاروں بھی وہاں پہنچ گئے۔ انھوں نے کتوں کو تھپتھپا کر دوبارہ ان کے پٹوں میں رسیاں ڈالیں اور خرگوش کو اپنے قبضے میں لے کر نئے شکار کی تلاش میں اگلے کھیتوں کی طرف بڑھ گئے۔

شکار کے اس تجربے نے سب کو دم بخود کر دیا تھا۔ خوف کا یہ عالم کچھ دیر اور رہتا کہ سید کے بولنے سے یہ طلسم ٹوٹ گیا: "کیا خرگوش صرف اپنے ملک میں ہوتے ہیں؟"

سید نے یہ سوال یوں تو محبوب چچا سے پوچھا تھا، لیکن اس وقت یا تو بے خیالی میں اُن کی آواز کچھ بلند ہو گئی، یا پھر شاید سب کی خاموشی نے اسے گونج دار بنا دیا۔ بہرحال وجہ جو بھی ہو، یہ آواز سنتے ہی سب نے چونک کر سید کو دیکھنا شروع کر دیا۔ اس وقت محبوب چچا، جو فائر کرنے میں عجلت دکھانے کے ساتھ ساتھ ایک دم سے جو منہ میں آئے، کہہ دینے میں کافی نیک نام تھے، سید کے اس اچانک سوال سے کچھ ایسے سٹپٹائے کہ ان سے کوئی جواب نہ بن سکا۔ مگر کسی نہ کسی کو تو جواب دینا ہی تھا۔ آخر حسین چچا نے بات سنبھالی اور ایک طرح سب کی ترجمانی کرتے ہوئے سید کو بتانے لگے:

"خرگوش دنیا کے تقریباً ہر ملک میں پائے جاتے ہیں۔ یہ بھی چوہوں کی طرح زمین

میں بل بنا کر رہتے ہیں۔ بلوں میں ہی بچے دیتے اور وہیں ان کی پرورش کرتے ہیں۔ خرگوش کے بل جنھیں بعض علاقوں میں بھٹ بھی کہا جاتا ہے، سرنگوں کی طرح ہوتے ہیں۔ لیکن ان سرنگوں کی ایک خاص بات یہ ہوتی ہے کہ اُن میں آنے جانے کے لیے صرف ایک منہ یا دروازہ نہیں ہوتا بلکہ خرگوش کئی کئی دروازے بناتا ہے تاکہ خطرے کے وقت جس دروازے سے موقع ملے نکل کر بھاگ جائے۔ دن کے وقت یہ اپنے بلوں ہی میں رہتے ہیں، لیکن صبح شام اور موسم کے لحاظ سے اکثر رات میں بھی کھیلنے کودنے اور کھانے کی تلاش میں ایک ساتھ باہر نکل آتے ہیں۔ ایسے میں اگر کسی خطرے کا احساس ہو جائے تو ان کا سردار، جو عموماً سب سے آگے رہتا ہے، فوراً اپنی پچھلی ٹانگوں سے زمین پر کھٹ کھٹ کر کے اپنے ساتھیوں کو خبردار کر دیتا ہے۔ یہ آواز سنتے ہی سارے خرگوش بھاگ بھاگ کر جھاڑیوں اور بلوں میں چھپ جاتے ہیں۔

"مادہ خرگوش سال میں کئی بار بچے دیتی ہے۔ ایک جھول میں دس دس بارہ بارہ بچے ہوتے ہیں۔ پیدائش کے وقت بچوں کے جسم پر رُواں یا بال نہیں ہوتے۔ ان کی آنکھیں بھی بند ہوتی ہیں۔ اس لیے مادہ خرگوش کو شروع میں بڑی احتیاط کے ساتھ بچوں کی دیکھ بھال کرنا پڑتی ہے۔ وہ اپنے پیٹ پر سے بال نوچ نوچ کر بل کے اندر بچوں کے لیے نرم بچھونا تیار کرتی ہے تاکہ انھیں آرام اور گرمی ملے۔ اس وقت وہ کسی دوسرے خرگوش کو بچوں کے پاس نہیں آنے دیتی کہ کہیں وہ بچوں کو نقصان نہ پہنچا دے۔ رفتہ رفتہ آنکھیں بھی کھلتی ہیں اور جسم پر رُواں بھی پیدا ہو جاتا ہے۔ اس کے بعد وہ اپنے بل میں سے نکل کر ماں باپ کے ساتھ باہر نکل کر چہل قدمی اور چرنا بھی شروع کر دیتے ہیں۔"

اتفاق سے حسین چچا کو خرگوشوں کے بارے میں اتنی باتیں بتانے کا موقع صرف اس لیے مل گیا کیوں کہ کتوں کے شکاریوں کے چلے جانے کے بعد کچھ ساتھی ہاتھ پیر سیدھے کرنے کے لیے جیپ سے نیچے اتر آئے تھے۔ اب چونکہ زیادہ دیر کرنے اور بے مقصد رکے رہنے کا موقع نہ تھا، اس لیے سب کو بلا کر فوراً ہی پھر دوبارہ سفر شروع کر دیا گیا۔

وہاں سے چلے ہوئے ابھی کچھ زیادہ دیر نہ ہوئی تھی کہ سید نے ایک نمایاں فرق یہ نوٹ کیا کہ بڑھاپور کے شمال میں، یعنی جس طرف جیپ دوڑی چلی جا رہی تھی، وہاں

Visit for more best books www.pdfbooksfree.pk

کھیتوں کے آخری سرے پر بہت قریب اتنے زیادہ پیڑ اُگے ہوئے ہیں کہ وہ دور سے
ایک دیوار کی طرح دکھائی دے رہے ہیں۔ چند لمحوں کے لیے تو وہ سٹپٹائے کہ آخر یہ کس قسم کی یہ
انوکھی دیوار آخر کس لیے بنائی گئی ہے۔ مگر پھر سٹ سے بجلی کی طرح ان کے دماغ میں یہ خیال کوندا
کہ جسے وہ پیڑوں کی دیوار سمجھ رہے ہیں، کہیں یہ وہی جنگل تو نہیں جہاں ہم جا رہے ہیں۔
سیّد شاید کچھ دیر اور، کیا ہے اور کیا نہیں ہے کی اُدھیڑ بن میں رہتے۔ لیکن دوسرے ہی لمحے
اُن کے بزرگ ساتھیوں کے نعرۂ مسرت نے اس بات کی تصدیق کر دی کہ ان کا خیال صحیح
ہے اور پیڑوں کی یہ دیوار گھنے جنگل کا ہی طویل سلسلہ ہے جس کے ایک حصّے کا نام کالاڈھونگی
ہے یعنی وہی بلاک جہاں جا رہے ہیں۔

بڑھاپور کے کھیت اندازے کے مطابق جلدی ہی ختم ہو گئے۔ کھیتوں کے بعد "کھو"
نام کی وہ چوڑی ندی بھی آسانی سے پار کر لی گئی جو کھیتوں سے گزرتے وقت پہلے دکھائی نہیں
دی تھی۔ اس وقت ندی میں گرمی کا موسم ہونے کی وجہ سے بہت کم پانی تھا، اور جہاں
سے اُسے پار کیا گیا، وہاں اتنا ہی پانی تھا کہ جیپ کے صرف پہیئے ہی گیلے ہوئے۔ لیکن اگر
برسات کا موسم ہوتا تو اس میں نہ صرف پانی گہرا ہوتا بلکہ وہ اتنی تیزی سے بہہ رہا ہوتا کہ اس میں
سے ہو کر گزرا نہیں جا سکتا تھا۔

"کھو" پار کرتے ہی جنگلات کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ بل کھاتی پکی سڑک کے دونوں طرف
کچھ دور تو چھدری جھاڑیوں اور چھوٹے چھوٹے پیڑوں نے ساتھ دیا۔ لیکن یہ ساتھ عارضی نکلا اور
کچھ ہی دیر میں ایسا لگا جیسے گھنی جھاڑیوں اور پیڑوں کے سیلاب میں گھر گئے ہیں۔ ہر طرف حدِ نگاہ تک
پیڑ ہی پیڑ اور جھاڑیاں ہی جھاڑیاں۔ راستے میں جنگل کے کئی ٹکڑے تو ایسے ملے جہاں پیڑوں اور
بیلوں کی ایک دوسرے سے گلے ملتی ٹہنیوں اور شاخوں نے مل کر سورج کے منہ پر کچھ ایسی نقاب
ڈال دی تھی کہ اس کی کرنیں زمین تک پہنچ ہی نہیں پا رہی تھیں، اور اس کے باوجود کہ سورج
مہاراج کو شب بخیر کہنے کے لیے ابھی ڈیڑھ دو گھنٹے کا سفر اور طے کرنا تھا، وہاں سے گزرتے ہوئے
ایسا لگا کہ رات ہوا ہی چاہتی ہے۔

جیسے کسی فلم میں جلدی جلدی سین تبدیل ہونے لگیں اور ابھی ایک منظر سے طبیعت

سیر نہ ہو پائی ہو کہ فوراً دوسرا سین نگاہوں کے سامنے آجائے، اُس وقت کچھ ایسا ہی معاملہ
سیّد کے ساتھ بھی ہو رہا تھا۔ ان کی نظریں ابھی جنگل کے ایک حصّے کو کھنگالنے کی کوشش کرتیں
تو کبھی دور دور کھونے میں کسی انجانی چیز کی تلاش میں لگ جاتیں۔ نظروں کے سامنے تیزی سے نئے
نئے منظر آتے چلے جا رہے تھے، مگر وہ اس ڈر سے کسی ایک سمت اپنی نگاہیں قائم نہیں رکھ
پا رہے تھے کہ کہیں دوسری جگہ اس سے بھی اچھا سین ان کا منتظر نہ ہو اور وہ غفلت میں اسے
دیکھنے سے محروم رہ جائیں۔

سیّد نے دیکھا کہ اگر جنگل کے کچھ قطعے ایسے ہیں جہاں طرح طرح کے پیڑ پودے، بیلیں
اور جھاڑیاں حسن سماتے ڈھنگ سے زمین پر قبضہ جمائے ہیں تو اس کے ساتھ ہی جگہ جگہ ایسے علاقے
بھی مل رہے ہیں جہاں ایک قسم، ایک جیسے رنگ روپ اور ایک جیسے قد و قامت کے پیڑ
ترتیب اور قرینے سے اس طرح لگے ہیں کہ جیسے اسکول میں بچے قطار در قطار ایک جیسی یونیفارم
پہنے ڈرل کے لیے کھڑے ہوں۔

سیّد کو جنگل میں ایک خاص بات جہاں کی بُو باس میں معلوم ہوئی۔ انھوں نے محسوس کیا
کہ جہاں کی پوری فضا میں ایک انوکھی مہک بسی ہوئی ہے۔ ایک ایسی بھینی مہک جو عطر کی طرح تیز
نہ ہونے پر بھی فرحت و تازگی کا احساس دلاتی، روح کی گہرائیوں میں اُترتی جا رہی ہے۔ سیّد نے
دیکھا کہ جنگل میں جہاں تہاں خود رو پودے اُگے ہوئے ہیں، جن میں سے بیشتر پھولوں سے لدے
پڑے ہیں۔ خود رو پودوں کی طرح اس وقت بہت سے بڑے پیڑ بھی بہار پر تھے اور ہزاروں
لاکھوں کی تعداد میں شہد کی مکھیاں ان پیڑ پودوں کے گرد منڈلاتی اور پھولوں پر بیٹھتی اُڑتی
دکھائی دے رہی تھیں۔ سیّد کو اس وقت اپنی درسی کتاب کے ایک سبق کا خیال آگیا جس میں بڑی
تفصیل سے شہد کی مکھیوں کی کہانی بتائی گئی تھی۔ لیکن یہ وقت پچھلی باتوں کو یاد کرنے یا کسی ایک چیز پر توجہ
قائم رکھنے کے لیے موزوں نہ تھا۔ اس لیے انھوں نے اپنی نظریں پھولوں اور شہد کی مکھیوں سے
ہٹائیں اور ایک بار پھر گردن گھما گھما کر جنگل کا جائزہ لینا شروع کر دیا۔

سیّد کو راستے سے تھوڑی دور ہٹ کر ایک جگہ جنگل میں کچھ پانی سا لگا جیسے جھیل یا پوکھر سی
ہوتی دکھائی دی۔ وہاں بڑے اونچے اونچے پیڑ کھڑے تھے، لیکن تھے چھدرے۔ پوری زمین

Visit for more best books www.pdfbooksfree.pk

پر گھاس اُگی ہوئی تھی جو شاید پانی کی کمی کی وجہ سے پیلی پڑ گئی تھی۔ مویشی اسی سوکھی گھاس کو بڑے شوق سے کھا رہے تھے۔ اس وقت ان کے پاس کوئی رکھوالا نظر نہیں آ رہا تھا۔ ان میں سے چند مویشیوں کی گردنوں میں گھنٹیاں لٹک رہی تھیں جو اُن کے ملنے جلنے سے بج رہی تھیں۔ اس کا مطلب تھا کہ ان کے مالک کہیں آس پاس ہی تھے جنھیں گھنٹیوں کی آواز سے اپنے جانوروں کا پتا چل رہا ہو گا کہ وہ کہاں ہیں، اور اس طرح وہ ایک جگہ بیکار کھڑے رہنے کے بجائے اپنا وقت کسی اور کام میں لگا رہے ہوں گے۔ اور سچ مچ تھا بھی ایسا ہی۔ وہاں سے کچھ ہی دور ایک پہاڑی نالے کے قریب گھاس پھوس کی آٹھ دس جھونپڑیاں نظر آئیں جو آمنے سامنے دو لائنوں میں بنی ہوئی تھیں۔ جھونپڑیوں کے سامنے چند عورتیں چھوٹے بچوں کو پاس بٹھائے کھانا پکانے میں لگی تھیں، جبکہ دو مرد چھوٹی چھوٹی چارپائیوں پر بیٹھے حقے گڑگڑا رہے تھے۔ اور دو قریب ہی زمین پر بیٹھے رسیاں بٹنے میں لگے تھے۔

جیپ، جنگل کی کچی سڑک پر چلتی ہوئی جھونپڑیوں کے قریب پہنچنے ہی والی تھی کہ اچانک دِل دہلا دینے والی ایک آواز سنائی دی۔ اسی آواز کے ساتھ مویشیوں میں بھگدڑ مچی اور جنگل کے پُرسکون ماحول میں بھونچال سا آگیا۔ سب کی نظریں خود بخود اس آواز کی طرف اُٹھ گئیں اور یہ سمجھتے دیر نہ لگی کہ کوئی بھوکا شیر اپنے پیٹ کی آگ بجھانے کے لیے کسی بھینس پر حملہ کر بیٹھا ہے۔

شیر حملہ کرنے کے لیے کسی مناسب موقع کی تلاش میں کافی دیر سے تاک لگا رہا ہو گا۔ اور جب اُسے اطمینان ہو گیا ہو گا کہ میدان صاف ہے، تو پھر ایک فیصلہ کُن ارادے کے ساتھ وہ جھکے جھکے دبے پاؤں بھینس کی طرف لپکا ہو گا اور پھر اچانک اوسان خطا کر دینے والی خوفناک دہاڑ کے ساتھ ایک لمبی جست لگا کر بھینس پر ٹوٹ پڑا ہو گا کہ اسے زمین پر گرا کر بے بس کر دے اور اپنے خنجر جیسے تیز اور مضبوط دانتوں سے اس کی ٹنگا بوٹی کر ڈالے۔

شیر نے ایک ایسی بھینس کو نشانہ بنایا تھا جو گھاس چرتے چرتے اکیلی اُس طرف نکل گئی تھی جہاں گھاس اونچی تھی اور جھاڑیاں بھی ذرا قریب قریب اُگی ہوئی تھیں۔ شیر بھینس کی کمر پر سوار اس کی موٹی گردن سے لپٹا ہوا تھا، لیکن بھینس کچھ زیادہ ہی طاقتور ثابت ہوئی۔

چھ من وزنی ٹکر کھانے کے باوجود، وہ زمین پر نہیں گری اور شیر کو اپنی کمر پر لیے لیے تیزی سے جھونپڑیوں کی طرف بھاگ پڑی۔

اس وقت ایک عجیب بات یہ دیکھنے میں آئی کہ دوسری بھینسوں نے جب دیکھا کہ شیر نے ان کی ایک ساتھی کو پکڑ لیا ہے تو بجائے اس کے کہ اپنی جان بچانے کے لیے ڈر کر اِدھر اُدھر بھاگتیں، وہ مشتعل ہو گئیں اور اپنے سے کہیں زیادہ طاقتور اور خونخوار درندے سے مقابلہ کرنے پر آمادہ ہو گئیں اور جیسے کسی کمانڈر نے انھیں ایک ساتھ جنگ میں کود پڑنے کا حکم دیا ہو، انھوں نے اپنی دُمیں اونچی کر لیں اور نتھنوں سے پھوں پھوں کی آوازیں نکالتی سَروں کو جھکا کر ایک ساتھ تیزی سے اس طرف دوڑ پڑیں جس طرف شیر والی بھینس بھاگی جا رہی تھی۔ ان کے انداز سے ایسا لگ رہا تھا جیسے انھوں نے تہیہ کر لیا ہے کہ اپنے مضبوط سینگوں اور بھاری بھرکم سَروں کی ٹکریں مار مار کر شیر کا بھُرکس نکال دیں گی۔

غالباً شیر کو بھی اس بات کا اندازہ تھا کہ اگر ایک ساتھ مل کر مقابلہ کیا جائے تو مقابلہ کرنے والے چاہے کتنے ہی کمزور کیوں نہ ہوں اور جس کا مقابلہ کیا جا رہا ہو، وہ کتنا ہی طاقتور ہو، جیت مِل کر مقابلہ کرنے والوں ہی کی ہوتی ہے۔ شاید اسی لیے جب شیر نے بھینسوں کو اپنی طرف بڑھتا ہوا دیکھا جو اُس وقت مَرنے مارنے پر تلی ہوئی تھیں تو اُس نے اسی میں عافیت سمجھی کہ وہاں سے بھاگ جائے۔ اس نے دوڑتی ہوئی بھینس سے زمین پر چھلانگ لگائی اور جس تیزی سے اس نے حملہ کیا تھا، اسی تیزی سے پلک جھپکتے ہی جھاڑیوں کی آڑ میں نظر سے اوجھل بھی ہو گیا۔

زخمی بھینس جھونپڑیوں کے پاس پہنچ کر ذرا کے ذرا رُکی۔ اس نے سر اٹھا کر گھبرائے ہوئے انداز میں اِدھر اُدھر دیکھا اور پھر بھاگ کر ایک جھونپڑی میں چلی گئی۔ وہ غالباً رات کے وقت اسی میں رہتی ہو گی، کیونکہ دروازے کے پاس گھاس پھوس اور بھوسا بکھرا ہوا تھا جس سے پتا چل رہا تھا کہ یہ جھونپڑی مویشیوں کے لیے ہے۔

بھینس کو وہاں بھی چین نہ ملا۔ وہ پھر باہر نکل آئی اور شاید یہ سمجھتے ہوئے کہ انسانوں کے درمیان زیادہ محفوظ رہے گی، وہ جیپ کے پاس چلی آئی جہاں اس وقت تک

Visit for more best books www.pdfbooksfree.pk

ان جھونپڑیوں کے رہنے والے بھی آکر جمع ہو چکے تھے اور اپنے اپنے انداز میں اس سانحے پر غم و غصے کا اظہار کر رہے تھے۔

بھینس کی گردن خون سے لال ہو رہی تھی۔ وہ اس وقت سخت بے چین اور گھبرائی ہوئی تھی۔ اس کی یہ حالت دیکھ کر ایک بوڑھے نے بڑھ کر پہلے تو کمر تھپتھپاتے ہوئے اُسے پچکارا، پھر اس کے سینگوں میں رسّی باندھ دی کہ اسے قابو میں کر کے کچھ دوا دارو کی جا سکے۔ اس وقت ان لوگوں کے پاس دوا کے نام پر صرف ایک ہی چیز تھی۔ اور وہ تھی پوٹاشیم پرمیگنٹ۔ یعنی وہی لال رنگ کی دوا جسے پنکی بھی کہتے ہیں اور جو عموماً ٹینک اور کنوؤں وغیرہ میں بھی ڈالی جاتی ہے جس سے پانی میں موجود جراثیم ختم ہو جاتے ہیں۔ کسی کے کہنے پر ایک عورت دوڑی دوڑی گئی اور کاغذ کی ایک پڑیا لے آئی جس میں پوٹاش تھی۔ اسی بوڑھے نے جلدی سے اپنے ہاتھ کرتے کے دامن سے پونچھے اور پھر چٹکی میں پوٹاش کے ذرّات لے کر ان زخموں پر چھڑکنے شروع کر دیے جو شیر کے نکیلے دانت لگنے سے بھینس کی گردن میں پڑ گئے تھے اور جن سے خون رِس رہا تھا۔ پھر شاید یہ دیکھتے ہوئے کہ دوا پوری طرح زخم کے اندر نہیں جا رہی ہے، اس نے ایک زخم پر اپنی انگلی کا دباؤ دیا۔ اس وقت سب کی نظریں اس بوڑھے کے ہاتھوں پر لگی تھیں جو ایک سرجن کی طرح بھینس کے زخموں کا علاج کر رہا تھا۔ جب اس نے زخم پر انگلی کا دباؤ دیا تو سب یہ دیکھ کر حیرت زدہ رہ گئے کہ بوڑھے کی پوری انگلی زخم کے اندر چلی گئی ہے۔ اس سے اندازہ ہوا کہ شیر کے دانت کافی بڑے بڑے ہوں گے اور یہ محض اتفاق تھا کہ شیر کے منہ میں آجانے کے باوجود بھینس بھاگنے میں کامیاب ہو گئی، ورنہ ایک بار شیر کے خنجر جیسے تیز نکیلے ناخنوں اور فولاد کی طرح مضبوط اور بھالے جیسے لمبے دانتوں کی پکڑ میں آجانے کے بعد جان بچنے کے واقعات بس کبھی کبھار ہی دیکھنے میں آتے ہیں۔

زخموں میں پوٹاش بھرنے کا کام جلدی ہی پورا ہو گیا۔ زخمی بھینس بھی جان لیوا ہنگامے سے دوچار ہونے کے بعد نڈھال ہو کر زمین پر بیٹھ گئی تھی، اور ادھر شام کے سائے تیزی سے لمبے ہونا شروع ہو گئے تھے۔ مجبوراً اس ڈر سے کہ کہیں راستے میں ہی رات نہ ہو جائے، سفر پھر شروع کر دیا گیا۔

راستے کی بات چیت سے سیّد صاحب کو جھونپڑیوں میں رہنے والے ان لوگوں کے بارے میں معلوم ہوا کہ پیشے کے اعتبار سے یہ لوگ گوالے ہیں جو اپنے مویشیوں کے ساتھ تقریباً پورے سال جنگل میں ہی رہتے سہتے ہیں۔ تقریباً اس لیے کہ ان لوگوں کو برسات شروع ہونے سے تھوڑا پہلے، محض اتنے دنوں کے لیے اس جگہ کو چھوڑنا پڑتا ہے جب برسات میں تیز بہتے ہوئے چھوٹے بڑے نالوں اور اس سے آگے پڑنے والے دریا کو پار کرنا ممکن نہیں رہتا۔ عام انسانی آبادیوں سے دور رہنے پر انھیں سیکڑوں طرح کی مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے، لیکن انھیں شہروں میں رہنا ایک آنکھ نہیں بھاتا جہاں ہر وقت موٹروں اور کارخانوں سے نکلنے والے زہریلے دھوئیں اور شور کی وجہ سے طبیعت پر ایک عجیب سا بوجھ اور گھٹن کا احساس رہتا ہے اس کے برعکس انھیں پسند ہے آلودگی اور کثافت سے پاک جنگل کی تازہ ہوا، جہاں بہنے والے ندی نالوں کا صاف ستھرا میٹھا پانی، خودرو پیڑ پودے اور پھولوں کی دِلوں کو مست کر دینے والی مہک اور سب سے زیادہ یہاں کی آزاد اور کھلی فضا ـــــ غرض ان سب سے انھیں اتنا پیار اور لگاؤ ہے کہ وہ کسی تکلیف کو نہیں گردانتے اور ہر طرح کی پریشانیوں سے دوچار رہنے کے باوجود جنگلوں میں ہی رہنا پسند کرتے ہیں۔

ایک پہاڑی نالہ جس کے قریب گوالوں کی جھونپڑیاں بنی ہوئی تھیں، اس سڑک کو کاٹتا ہوا گزر رہا تھا جس پر جیپ دوڑی چلی جا رہی تھی۔ سیّد نے دیکھا کہ وہاں سڑک کے دونوں سروں پر بڑے بڑے چپٹے پتھر ایک دوسرے پر جما کر اس طرح رکھے گئے ہیں کہ دونوں طرف مضبوط دیواریں بن گئی ہیں۔ اور ان دیواروں پر موٹے موٹے لکڑی کے شہتیر رکھ کر ایک ایسا پُل بنا دیا گیا ہے جس پر بھاری بھاری گاڑیاں تک آسانی سے گزر سکتی ہیں۔ سیّد نے یہ بھی نوٹ کیا کہ اس وقت شاید گرمی کا موسم ہونے کی وجہ سے نالے میں پانی نہیں چل رہا تھا، پھر بھی پُلیا کے نیچے گہرے اور چوڑے گڑھے میں پانی بھرا ہوا تھا۔ یہ پانی رُکا ہوا ہونے کے باوجود میلا یا گدلا نہ تھا، بلکہ ایسا صاف شفاف تھا کہ جب جیپ کی رفتار کم کر کے اس پر سے گزارا جا رہا تھا تو پانی کی تہہ میں ریت پر بکھرے ہوئے چھوٹے بڑے پتھر اس حد تک صاف دکھائی دیے کہ اگر کوئی پوچھتا کہ وہ کیسے ہیں، تو ان کے بارے میں یہاں تک بتایا جا سکتا تھا کہ وہ کس کس رنگ کے ہیں۔

Visit for more best books www.pdfbooksfree.pk

سیّد نے سوچا کہ خشک نالے میں اس طرح صاف پانی جمع رہنے میں کوئی نہ کوئی راز ہو گا۔ موقع ملنے پر میں ابّو یا چچا جان سے اس بارے میں ضرور معلوم کروں گا کہ جب اس پُلیا کے آس پاس کوئی کنواں یا نل تک نہ تھا اور گرمی کی وجہ سے پہاڑی نالے میں دور دور تک صرف ریت اور پتھر ہی دکھائی دے رہے تھے تو پھر کس طرح اور کیوں وہاں اتنا ڈھیر سا پانی رُکا ہوا تھا۔

پُلیا سے ابھی دو ڈھائی سو گز ہی آگے بڑھے ہوں گے کہ سڑک پر ایک موڑ آیا اور جیپ آہستگی سے نئے راستے پر مڑ گئی، اور پھر چند ہی منٹوں میں اینٹوں کے بنے ایک ایسے پختہ مکان کے پاس جا کر رک گئی جہاں کچھ لوگ دائرہ بنائے چارپائیوں اور کرسیوں پر بیٹھے ہوئے تھے جیپ کے رُکتے ہی جبّار صاحب نے اس کے اندر بیٹھے ہی بیٹھے ایک زوردار سلام داغا:

"_____ السلام علیکم _____"

جیسے اپنی شناخت کراتے ہوئے ان لوگوں سے کہہ رہے ہوں، "سمجھے _____ یہ میں ہوں" _____ اور واقعی اس تعارف نے اپنا اثر دکھلایا اور وہاں بیٹھے ہوئے سبھی افراد خوشی کا اظہار کرتے ہوئے مہمانوں کا خیر مقدم کرنے کے لیے جیپ کے پاس دوڑے چلے آئے۔

سیّد نے دیکھا کہ گھنے جنگل میں بنا یہ مکان اُن مکانوں سے کافی مختلف تھا جیسے مکان قصبات اور شہروں کے اندر زیادہ آبادی والے محلّوں میں ہوا کرتے ہیں۔ یہ مکان اُن عام مکانوں کی طرح بھی نہ تھا جن میں عموماً کھڑکیوں وغیرہ کا زیادہ خیال نہیں رکھا جاتا اور کمروں کے سامنے چہار دیواری سے گھرا چھوٹا موٹا صحن رکھ کر تازہ ہوا، دھوپ اور روشنی کی گنجائش پیدا کر لی جاتی ہے۔ ویسے صحن تو اس مکان میں بھی تھا، لیکن فرق یہ تھا کہ اس کا لمبا چوڑا صحن کمروں اور چہار دیواری سے گھرا ہوا نہ تھا، بلکہ دور دور تک اس کے چاروں طرف پھیلا ہوا تھا اور مکان کی مہورت میں صرف ایک چھت کے نیچے رہائش کی وہ تمام سہولیات مہیّا کر دی گئی تھیں جن کی موجودگی ایک مکمل گھر کے لیے ضروری سمجھی جاتی ہے۔ سیّد نے سوچا کہ میں شکار سے واپس جاؤں گا تو جنگل کی اور باتوں کے ساتھ ساتھ اپنے دوست محسن کو اس مکان کے بارے میں بھی تفصیل سے بتاؤں گا، اور تب مجھے لفظوں میں اس مکان کا نقشہ

کچھ اس طرح کھینچنا ہو گا:

ایک مکان جس کے بیچوں بیچ ایک بڑا کمرہ ـــــ کمرے کے درمیان میں ایک بڑی گول میز اور اس کے چاروں طرف کرسیاں لگی ہوئی، گویا اسے ڈرائنگ روم کی صورت میں بھی استعمال کیا جا سکے اور ڈائننگ روم کی حیثیت میں بھی۔ اسی کمرے کے دیوار میں ایک طرف بخاری اور چمنی بنی ہوئی کہ اگر آگ جلا کر کمرہ گرم کرنے کی ضرورت پڑے تو دھواں کمرے میں نہ گھمنڈے، بلکہ چمنی سے باہر نکل جائے اور آگ کے سامنے کرسیوں پر آرام سے بیٹھ کر ہاتھ پیر سینکے جا سکیں۔ اسی بڑے کمرے کے دائیں بائیں دو اور کمرے اور ان چھوٹے بڑے تینوں کمروں کے اطراف میں ایک کھلا برآمدہ۔ دائیں بائیں والے کمروں میں آنے جانے کے لیے راستہ بڑے کمرے سے بھی اور باہر برآمدے میں بھی۔ اس طرح بڑے کمرے میں چار دروازے، دو دروازے دوسرے کمروں میں جانے کے لیے اور دو دروازے ایک دوسرے کی مخالف سمتوں میں برآمدے سے ہو کر خود اس کمرے میں آنے جانے کے لیے۔ دونوں کمروں کی برآمدے کی طرف لگنے والی دیواروں میں بڑی بڑی کھڑکیاں اور کھڑکیوں میں لوہے کی سلاخوں کا جنگلا۔ جنگلے کے اوپر باریک جالی جس سے مچھر بھی نہ آ سکے۔ کھڑکیوں میں شیشوں والی کھڑکیاں لگی ہوئی کہ اگر باہر دیکھنا چاہیں تو کھڑکی بند ہونے کے باوجود باہر دیکھا جا سکے۔ دائیں بائیں والے کمروں سے ملے ہوئے دو الگ الگ باتھ روم تو دوسری طرف مرکزی بڑے کمرے سے باہر برآمدے والی گیلری میں ایک طرف اسٹور تو دوسری طرف باورچی خانہ۔ پوری عمارت پر چوڑی کھپریل کی چھپّر کی طرح ڈھلوان چھت۔ لیکن چھت کو ہموار رکھنے کے لیے لمبی لمبی کڑیوں کا مضبوط فریم اور ان پر خوبصورتی سے تختے جڑے ہوئے کہ دیکھنے میں بھی اچھے لگیں۔

سیّد نے سوچا کہ یہ مکان، جس کا نام بنگلہ یا ڈاک بنگلہ بتایا جا رہا ہے، جب نیا نیا بنا ہو گا تو کتنا اچھا لگتا ہو گا، کیونکہ اب بھی جبکہ اس کی اندرونی چھت کے تختے پرانے پڑ جانے کی وجہ سے کئی جگہ سے ٹیڑھے اور بوسیدہ ہو کر نیچے لٹک گئے ہیں، اور دیواروں کا پلاستر اُکھڑنے لگا ہے، اب بھی کتنا اچھا لگ رہا ہے۔

لیکن جب سیّد کی نظر بنگلے کے باہری حصّے میں برآمدے کے ایک ٹوٹے ہوئے کونے

Visit for more best books www.pdfbooksfree.pk

اور اُس کی اُدھڑی ہوئی چھت پر پڑی تو اُنھیں یہ بات کچھ عجیب سی لگی۔ سیّد کے خیال میں اس طرح کی ٹوٹ پھوٹ تیز ہوا یا آندھی سے ممکن نہ تھی۔ اسے دیکھنے پر ایسا لگ رہا تھا جیسے یا تو اس پر گھن برسائے گئے ہیں یا پھر کوئی ٹرک اس سے ٹکرا گیا ہے۔ اور سچ مچ کچھ ہوا بھی ایسا ہی تھا۔ برآمدے کے اس حصے پر گھن بھی برسے تھے اور ایک ٹرک نے ٹکر بھی لگا دی تھی۔ لیکن فرق یہ تھا کہ گھن برسانے اور ٹرک لاکر ٹکرا دینے کی غلطی کسی انسان نے نہیں کی تھی، بلکہ بے خیالی میں یہ خطا جنگل کے ایک ایسے باسی سے سرزد ہوگئی تھی جو ایک رات اتفاق سے گھومتا گھوماتا اپنے کنبے کے ساتھ ادھر آنکلا تھا۔

جنگل کا وہ باسی کون تھا، وہ یہاں کیوں آیا اور کس لیے اُس نے برآمدے کو نقصان پہنچایا، اس کی پوری کہانی سیّد کو اس وقت معلوم ہوئی جب بنگلے کے ایک کمرے میں ساتھ لایا ہوا سامان رکھنے کے بعد اسے بھی ان لوگوں کے پاس بیٹھنے کا موقع ملا جو دو دن پہلے ہی ' کالو شہید ' پہنچے تھے اور جن میں سے کچھ لوگ پہلے سے ہی بنگلے کے صحن میں کرسیوں اور چار پائیوں پر بیٹھے خوش گپیوں میں مصروف تھے۔

سیّد کو ان لوگوں کی باتوں سے اکیلی برآمدے والی کہانی کا نہیں، بلکہ کئی اور بھی باتوں کا پتا چلا جو موقع محل کے لحاظ سے اس وقت کافی اہم تھیں۔ مثلاً یہی کہ ——— وکیل صاحب جن کے نام شکار کا پرمٹ ہے، اس وقت بنگلے پر موجود نہیں ہیں ——— وہ دوپہر بعد صرف ایک آدمی کو لے کر یہ کہہ کر گئے تھے کہ ذرا جنگل کا سروے کرلوں اور اگر موقع مل گیا تو ایک آدھ جانور بھی شکار کرتا لاؤں تاکہ شام کے کھانے کا انتظام ہوسکے۔ وہ اپنے ساتھ کسی اور کو اس لیے نہیں لے گئے کیونکہ ان کے خیال میں زیادہ آدمیوں کے ایک ساتھ چلنے سے جنگل میں آواز زیادہ ہوتی اور شکار کے مواقع کم ہوجاتے ——— وکیل صاحب نے کہا تھا کہ پانچ بجے تک واپس آجائیں گے، مگر اب تو چھ بج رہے ہیں اور ان کا دور دور پتا نہیں ہے ——— بنگلے کی لکڑیوں والی اندرونی چھت میں، بچھو پیدا ہوگئے ہیں جو کبھی کبھی نیچے بھی ٹپک پڑتے ہیں اس لیے رات کو سب کے سب باہر میدان میں ہی سوئیں گے ——— بنگلے کے برآمدے کا وہ کونا ایک ہاتھی نے گرایا تھا، اور اس نے لوہے کے ہتھوڑے نہیں بلکہ اپنی سونڈ کے دو

ایک ٹکّے کھپریل پر جما دیے تھے اور جب محض کھجانے کے خیال سے اس نے اپنے کولھے کو برآمدے کے کونے سے رگڑا تھا تو بات کا بتنگڑ بنا دیا گیا اور خواہ مخواہ یہ سمجھ لیا گیا کہ کوئی وزنی ٹرک اس سے ٹکرا گیا ہے۔

ہاتھی بنگلے پر کب اور کیسے آئے، اس کی پوری تفصیل لوگوں کو بنگلے کے چوکیدار سے معلوم ہوئی۔ ہوا یہ کہ پچھلی برسات میں جب ندی نالوں کے چڑھنے کی وجہ سے آنے جانے کے راستے بند ہوگئے اور جنگل میں انسانوں کی آمدورفت تقریباً ختم ہوگئی تو جانوروں نے بھی سکھ کا سانس لیا اور وہ زیادہ بے فکری سے جنگل میں گھومنے پھرنے لگے۔ ایسے میں کچھ ہاتھی بھی ترنگ میں آکر ایک رات گھومتے گھوماتے بنگلے کی طرف نکل آئے۔ اس وقت بنگلے میں سنّاٹا تھا وہاں نہ تو کوئی سرکاری افسر ٹھہرا ہوا تھا اور نہ ہی کوئی شکاری پارٹی مقیم تھی۔ ڈاک بنگلے کا چوکیدار وہاں سے تھوڑے فاصلے پر اپنی کوٹھری میں سو رہا تھا۔ اس کی بُو یا تو بارش کی وجہ سے ہاتھی محسوس نہیں کرسکے، یا اگر محسوس کی بھی تو طاقت کے زعم میں یہ سوچ کر اس کی پروا نہ کی کہ اس وقت تو جنگل پر ہمارا راج ہے۔ جہاں چاہیں گھومیں پھریں۔ مجال ہے جو کوئی ہمارے سامنے آئے۔

برسات کی وجہ سے اُن دنوں ڈاک بنگلے کے صحن میں کوئی ایسی گھاس اُگ آئی تھی جسے ہاتھی ذرا شوق سے کھاتے ہیں۔ اس کے علاوہ بنگلے کے قریب بانس کے درخت بھی تھے جن میں ڈھیروں نئی نئی کونپلیں پھوٹ رہی تھیں۔ اب چاہے بانس کی نرم شاخوں اور کونپلوں کی کشش رہی ہو یا من پسند گھاس نے انھیں للچایا ہو، ہاتھی بنگلے پر آئے اور وہ بھی خاموشی سے نہیں، بلکہ خوب شور کرتے ڈنکے کی چوٹ پر آئے۔

چوکیدار کو ہاتھیوں کے آنے کا پتا اس وقت چلا جب انھوں نے تڑاق چٹاخ کی زوردار آوازوں کے ساتھ بانس کی بڑی بڑی ٹہنیاں حلق میں ٹھونسنا شروع کیں۔ اور ٹھیک اسی وقت ایک بڑے ہاتھی نے، جو غالباً ان کا سردار ہوگا، ایک زبردست چنگھاڑ بھی ماری، جیسے وہ جتا رہا ہو کہ خبردار، مابدولت اپنے خاندان کے ساتھ کھانا تناول فرما رہے ہیں۔ اگر کوئی آس پاس ہے تو فوراً ہٹ جائے، ورنہ ہم سے بُرا کوئی نہ ہوگا۔ ہاتھی کی تیز چیخ سے چوکیدار کی آنکھ کھل گئی

Visit for more best books www.pdfbooksfree.pk

وہ ہڑبڑا کر آنکھیں ملتا ہوا چارپائی پر بیٹھ گیا اور اسی کے ساتھ بے اختیار اس کی نظریں دروازے کی طرف یہ دیکھنے کے لیے اٹھ گئیں کہ وہ بند بھی ہے یا نہیں۔ حالانکہ وہ عادت کے مطابق اس رات بھی کواڑ بند کر کے لیٹا تھا، پھر بھی اسے تسلی نہ ہوئی اور اس نے اندھیرے میں ٹٹول کر یہ اطمینان کرنا مناسب سمجھا کہ دروازہ ٹھیک طرح بند ہے بھی یا نہیں۔

ہاتھیوں کو اتنے قریب پا کر بچارے چوکیدار کی سٹی گم ہو گئی۔ اسے لگا کہ دروازہ بند ہونے کے باوجود اس وقت وہ سخت خطرے میں ہے۔ وہ چاندنی رات تھی اتفاق سے اس وقت آسمان پر بادل نہیں تھے، اس لیے کھڑکی سے پورے چاند کی روشنی میں باہر کی ہر چیز صاف دکھائی دے رہی تھی۔ بنگلے کی طرح اس کھڑکی میں بھی لوہے کی سلاخیں اور جالی لگی ہوئی تھی لیکن چوکیدار اتنا خوف زدہ ہوا کہ اس نے کھڑکی کے کواڑ بھی بھیڑ لیے، اور صرف اتنی جگہ باقی رکھی کہ آنکھ لگا کر باہر دیکھ سکے۔ ہاتھی جتنی دیر بانس کھانے میں مشغول رہے، چوکیدار کھڑکی کے جھروکے سے ان کی نقل و حرکت دیکھتا رہا۔ جلد ہی بانس کی ٹہنیوں سے ہاتھیوں کی طبیعت سیر ہو گئی۔ وہ ترم ترم کرتے وہاں سے ہٹنے لگے، اور دھیرے دھیرے اس طرف بڑھنا شروع کر دیا جدھر چوکیدار کی کوٹھری اور بنگلے کی عمارت تھی۔

ہاتھیوں کو اپنی طرف بڑھتا ہوا دیکھ کر چوکیدار کے رہے سہے اوسان بھی جاتے رہے۔ وہ اتنا بوکھلایا کہ ایک بار تو اس کے جی میں آئی کہ بھاگ کر جلدی سے جنگل میں چھپ جائے۔ لیکن جس تیزی سے یہ بے وقوفی کا خیال اس کے دل میں آیا تھا، اسی تیزی سے چلا بھی گیا۔ جنگلوں کے بارے میں گہری معلومات اور تجربوں نے اسے اس غلطی سے باز رکھا، ورنہ ممکن تھا کہ رات کے اندھیرے میں کسی زہریلے سانپ، کسی شیر یا اس جیسے کسی اور خطرناک جانور سے سابقہ پڑ جاتا، اور پھر وہی مثال ہو جاتی کہ آسمان سے گرا کھجور میں اٹکا۔

البتہ چوکیدار نے یہ ضرور کیا کہ ہاتھیوں کو اپنی طرف بڑھتے دیکھ کر کھڑکی کے کواڑ پوری طرح بند کر لیے۔ اور آوازوں پر کان لگا کر ان کی آہٹ لینے کی کوشش کرنے لگا۔

کوٹھری تک پہنچنے میں ہاتھیوں نے زیادہ وقت نہیں لگایا۔ لیکن ان کے آنے میں خاص بات یہ رہی کہ ہاتھی اتنی آہستگی اور نرم پیروں سے وہاں تک آئے کہ ان کے آنے کا پتا

پیروں کی دھمک سے نہیں، ان کے سانس لینے سے چلا۔ خوش قسمتی سے ہاتھیوں نے کوٹھری میں دلچسپی نہیں لی اور ڈاک بنگلے کی طرف بڑھ گئے۔ خطرے کو ٹلتا دیکھ کر چوکیدار نے سکھ کا سانس لیا اور یہ دیکھنے کے لیے کہ ہاتھی بنگلے کی طرف کیوں گئے ہیں، پچھلی طرح کھڑکی کھول کر چاندنی کی دودھیا روشنی میں باہر جھانکنا شروع کر دیا۔

بنگلے کے لان میں پہنچ کر ہاتھی اس لمبی لمبی گھاس کو کھانے میں جٹ گئے جو وہاں برسات کی وجہ سے اُگ آئی تھی۔ گھاس کھاتے کھاتے ایک ہاتھی کے، جو قدوقامت اور ڈیل ڈول میں سب سے بڑا تھا، جی میں نہ جانے کیا آئی کہ وہ بنگلے کے بالکل قریب چلا گیا اور بنگلے کی ڈھلوان چھت کے ایک کونے سے اپنا کولھا رگڑنا شروع کر دیا۔ اب یا تو ہاتھی کو اپنی طاقت کا خیال نہ رہا یا اس نے چھت کی مضبوطی کا غلط اندازہ لگایا، ہو سکتا ہے اتفاق سے اس وقت کھجلی زیادہ اٹھی ہو، چھت کے اس حصے پر کولھے کا دباؤ کچھ زیادہ ہی پڑ گیا۔ ایک زوردار چرچراہٹ ہوئی اور دیکھتے ہی دیکھتے برآمدے کا ایک حصہ ٹوٹ کر نیچے لٹک گیا۔ ممکن ہے کہ اس طرح ٹوٹنے سے لکڑی کی کوئی نوک یا لوہے کی کوئی کیل دباؤ کے وقت کولھے میں چبھ گئی ہو، ہاتھی نے اس کے ساتھ ایک چیخ ماری اور جھنجھلاہٹ کا مظاہرہ کرتے ہوئے پلٹ کر چھت پر اپنی سونڈ سے دو چار گھونسے جما دیے۔ اور صرف اتنا ہی نہیں، وہاں سے ہٹتے ہٹتے سونڈ سے اس لکڑی کو پکڑ کر ایک جھٹکا بھی دے دیا جو اس کارروائی میں کچھ نیچے لٹک گئی تھی۔ اس ہنگامے کے بعد ہاتھیوں نے وہاں مزید رکنے کی ضرورت نہ سمجھی اور دیکھتے ہی دیکھتے جنگل میں روپوش ہو گئے۔

بنگلے پر ہاتھیوں کے آنے کی بات کیا نکلی کہ اس کے بعد کافی دیر تک ہاتھیوں کی ہی باتیں ہوتی رہیں۔ سید انھیں اپنی معلومات میں قیمتی اضافہ سمجھتے ہوئے بڑے غور سے سنتے رہے۔

" ہاتھیوں اور انسان کا بڑا پرانا ساتھ ہے۔ ہزاروں ہزار سال پرانا۔ یہ ساتھ اس وقت سے چلا آ رہا ہے جب انسان کو نہ فصل اگانی آتی تھی اور نہ جانور پالنے آتے تھے۔ نہ اس کے پاس کپڑے لتے ہوتے تھے اور نہ برتن بھانڈے۔ نہ گھر نہ در۔ جنگلوں جنگلوں گھومتے اور خودرو پھل پھولوں اور جنگلی جانوروں کے شکار پر زندگی گزارتے۔ ایسے میں جنگل کے دوسرے

Visit for more best books www.pdfbooksfree.pk

جانوروں کے ساتھ ساتھ انسان کا سابقہ ہاتھیوں سے بھی پڑتا۔ تب وہ ہفتوں مہینوں ہاتھیوں کا پیچھا کر کے ان کی نگرانی کرتے۔ اور پھر اس لالچ میں کہ کافی دنوں کے لیے کھانے کی تلاش سے فرصت مل جائے گی، موقع پاتے ہی کسی اکیلے دکیلے ہاتھی پر، کیا بچے اور کیا بڑے، ٹڈی دل کی طرح سب مل کر ایسے ٹوٹتے کہ لاکھ طاقت ور ہوتے ہوئے بھی اسے جان بچانی مشکل ہو جاتی۔

"انسان نے ہاتھیوں کو اپنے بس میں کرنا کب سے شروع کیا، اس کی صحیح تاریخ تو کوئی نہیں بتا سکتا، پھر بھی ایک خیال یہ ہے کہ خشکی کے سب سے بڑے اور بھاری بھرکم اس جانور کو اپنی مرضی پر چلانے کا سلسلہ ہزاروں سال سے چلا آ رہا ہے۔ کسی زمانے میں انھیں لڑائیوں میں بھی استعمال کیا جاتا تھا۔ لیکن اب ان کا یہ استعمال ختم ہو چکا ہے۔

"مغل بادشاہ پہلوانوں کی طرح ہاتھیوں کی کشتیاں کرا کے لطف حاصل کرتے تھے، وہ کھیل بھی کبھی کا بند ہو چکا۔ لیکن ہاتھیوں کے یہی دو مصرف تو ہو نہیں سکتے تھے۔ عقل کے پتلے انسان نے قبضے میں آئی اس جیتی جاگتی طاقت سے فائدہ اٹھانے کے اور بہت سے کام تلاش کر لیے۔ اب آج کہیں کارخانوں میں وزنی وزنی گاڑیاں ہاتھیوں سے کھنچوائی جا رہی ہے، تو کہیں لکڑیوں کے بھاری بھاری شہتیر، پتھر اور اس جیسا دوسرا وزنی سامان اِدھر سے اُدھر رکھنے کے لیے ہاتھیوں سے 'کرین' کا کام لیا جا رہا ہے۔

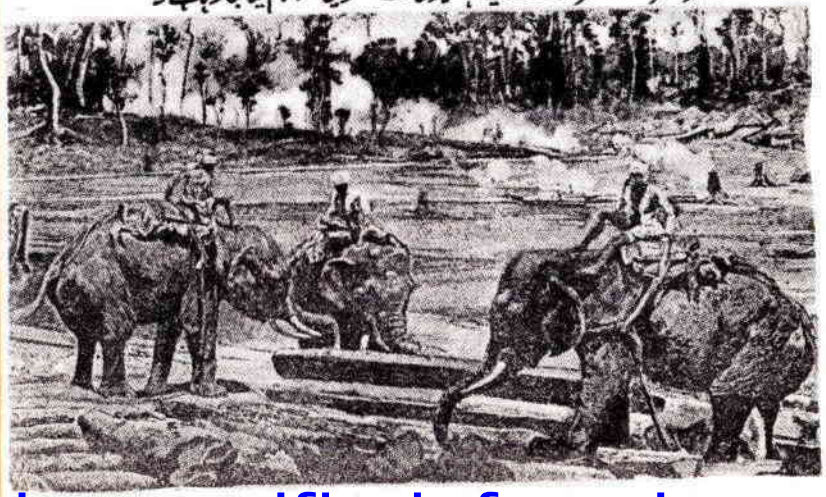

گھوڑوں کے بارے میں ایک کہاوت ہے کہ ان کی سواری کریں رئیس یا سائیس۔ یعنی یا تو مالدار لوگ گھوڑے کی سواری کرتے ہیں یا پھر ان کی دیکھ بھال کرنے والے غریب ملازم۔ کچھ ایسی ہی بات ہاتھیوں کے بارے میں کہی جا سکتی ہے۔ اوسط درجے کے عام آدمی تو اس کے پالنے کی بات سوچ بھی نہیں سکتے۔ یہاں تک کہ اس کا خرچ تو 'اچھے کھاتے پیتے' کہلائے جانے والے بھی برداشت کرنے کی سکت نہیں رکھتے۔ اسی لیے اب ہاتھیوں کو یا تو بہت بڑے زمیندار پالتے ہیں یا پھر سادھو فقیر۔ ہاتھی چڑیا گھروں، سرکسوں اور کہیں کہیں مندروں میں بھی پالے جاتے ہیں۔ لیکن وہاں ان کے پالنے کا مقصد نمائش، تفریح اور اس بہانے پیسے کمانا ہوتا ہے۔ شادی بیاہ جیسی سماجی تقریبات میں، کبھی مذہبی اور سیاسی جلسے جلوسوں میں اور یہاں تک کہ بعض مخصوص قومی تقریبات میں بھی ہاتھیوں کو آگے رکھ کر شان و شوکت بڑھانے کا کام لیا جاتا ہے۔ ہاتھی فلموں میں بھی کام کرتے ہیں۔ ہاتھیوں پر بیٹھ کر شکار کھیلا جاتا ہے، فوٹو گرافری اور سیر کی جاتی ہے اور کہیں کہیں تو مسافروں اور ان کے سامان کو ندی نالوں کے پار کرانے کی خدمت بھی کشتی کی جگہ ہاتھیوں سے ہی لی جا رہی ہے۔ کچھ بھی ہو، ہاتھی کی سواری میں آتا ہے مزہ۔ بچے تو اس کی سواری کر کے ایسے خوش ہوتے ہیں کہ بس نہ پوچھیے اس کے بعد انھیں برسوں کے لیے اپنے ہم جولیوں پر رعب جمانے کا موقع مل جاتا ہے کہ کیا سمجھتے ہیں آپ ——— ہم ہاتھی کی سواری کر چکے ہیں!

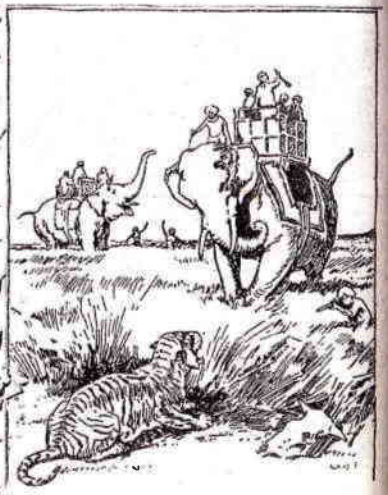

"ہاتھی قد و قامت میں بڑا تو اسی مناسبت سے اس کی باتیں بھی بڑی بڑی۔ اب یہی سمجھیے کہ پالتو جانوروں میں ذہانت

Visit for more best books www.pdfbooksfree.pk

کے اعتبار سے کتّے کے بعد ہاتھی کا ہی نمبر آتا ہے۔ ہاتھی کی ایک خصوصیت تو ایسی ہے جس کو کوئی دوسرا پالتو جانور پہنچ ہی نہیں سکتا، اور وہ یہ کہ ہم جہاں اور جتنے بھی پالتو ہاتھی دیکھتے ہیں، ان میں ایک بھی ہاتھی ایسا نہیں ہوتا جو انسانوں کے پاس پہلے سے موجود ہاتھیوں سے پیدا ہُوا ہو، بلکہ وہ سب کے سب بچپن میں یا جوانی میں، کبھی نہ کبھی کسی نہ کسی جنگل سے ہی پکڑ کر لائے ہوئے ہوتے ہیں۔ یہ سلسلہ آج سے نہیں، ہزاروں سال پہلے اُس وقت سے پوری دنیا میں چلا آرہا ہے جب سے انسان نے ہاتھیوں کو پالتو بنانا شروع کیا۔ مزے کی بات یہ ہے کہ جنگل سے ہاتھیوں کو پکڑنے سے لے کر انھیں بعد میں انسان سے مانوس اور پھر عمر بھر کے لیے ان کا تابعدار بنانے تک جتنے بھی مرحلے آتے ہیں، ان سب میں انسان کی مدد خود ہاتھی کے بھائی بند، پالتو ہاتھی ہی کرتے ہیں۔

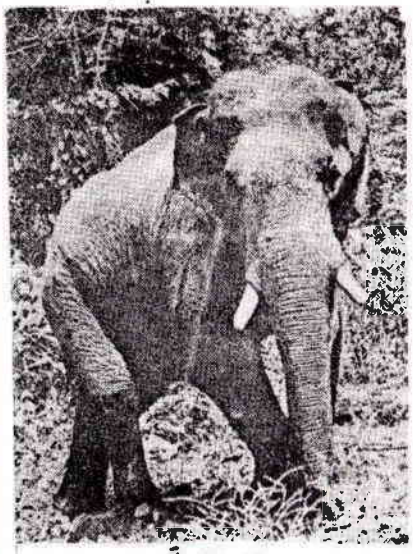

ہندستانی ہاتھی

"کسی زمانے میں کئی قسم کے ہاتھی پائے جاتے تھے، لیکن اب پوری دنیا میں ان کی صرف دو قسم کی نسلیں باقی رہ گئی ہیں۔ ایک ایشیائی اور دوسری افریقی۔ افریقی ہاتھی قد میں ہندستانی ہاتھیوں سے بڑے ہوتے ہیں۔ ایک افریقی نر ہاتھی کی اونچائی زمین سے کندھوں تک عموماً گیارہ فٹ (تین اعشاریہ چار میٹر) اور اس کے دانت چھ سے آٹھ فٹ تک لمبے ہوتے ہیں لیکن ایشیائی ہاتھی، جن میں ہندستانی اور سری لنکا کے ہاتھی شامل ہیں، دس فٹ سے اونچے نہیں ہوتے اور ان کے دانت بھی پانچ فٹ سے زیادہ نہیں بڑھ پاتے۔ ایک فرق یہ ہوتا ہے کہ ایشیائی نسل کی مؤنث (مادہ ہاتھی) کے دانت یا تو بالکل نہیں ہوتے اور اگر

ہوتے بھی ہیں تو بہت چھوٹے۔ لیکن افریقی نسل کی سبھی ہتھنیوں کے دانت ہوتے ہیں، مگر نر کے مقابلے وہ کچھ چھوٹے ہوتے ہیں۔

"ایشیائی اور افریقی ہاتھیوں میں کچھ اور فرق بھی ہوتا ہے۔ مثلاً افریقی ہاتھی کے کان بڑے بڑے تو ایشیائی کے چھوٹے۔ افریقیوں کا ماتھا اندر کو دبا ہوا اور سونڈ جبڑ کے پاس سے کچھ آگے کو نکلی ہوئی تو ایشیائیوں کا ماتھا چپٹا اور سونڈ بھی آگے کو اُبھری ہوئی نہیں۔ ایشیائی ہاتھیوں کی سونڈ کے سرے پر ایک نوک تو افریقی ہاتھیوں کی سونڈ کے سرے پر اوپر نیچے دو نوکیں، جس سے چھوٹی سے چھوٹی چیز کو پکڑنے میں آسانی۔

افریقی ہاتھی

"اب سے پہلے ہاتھیوں کے بارے میں ایک عام خیال یہ تھا کہ ان کی عمریں بھی انسانوں کی طرح ہوتی ہیں۔ یعنی صحت اگر اچھی رہے تو سو سال تک کی خبر لائیں۔ لیکن نئی تحقیق نے اسے غلط ثابت کر دیا ہے۔ نئی تحقیق کے مطابق ہاتھی زیادہ سے زیادہ ساٹھ سال تک جیتا ہے۔ پیدائش کے وقت ہاتھی کے بچے کا وزن کوئی سو کلو گرام (ایک کوئنٹل) اور قد لگ بھگ ۴۴ انچ

Visit for more best books www.pdfbooksfree.pk

ہوتا ہے۔ پیدائش کے بیس پچیس منٹ بعد ہی بچہ اپنے پیروں پر کھڑا ہو جاتا ہے اور اس کے ایک دو گھنٹے بعد اس قابل ہو جاتا ہے کہ اپنی ماں کے ساتھ تھوڑا بہت چل سکے۔ ایسے میں اگر بچے کی راہ میں کوئی رکاوٹ آئے تو ماں اپنی سونڈ سے اُسے ہٹا کر راستہ صاف کر دیتی ہے۔ اگر رکاوٹ بڑی یا ہٹائے جانے کے قابل نہ ہو تو ماں بچے کو سونڈ میں اُٹھا کر پار کرا دیتی ہے۔ انسانوں کی طرح ماں ہاتھی بھی اپنے چھوٹے بچوں کی دیکھ بھال بڑی احتیاط اور توجہ سے کرتی ہے۔ وہ اسے چھانٹ چھانٹ کر پیڑوں کی نرم کونپلیں اور پتے کھلاتی ہے۔ وقت پر پانی پلاتی اور نہلاتی ہے۔ جسم کی مالش کرتی اور سہلاتی ہے۔ نر ہاتھی اپنے بچوں سے اس طرح کا واسطہ نہیں رکھتے، لیکن خطرے کے وقت بچوں اور بڑوں کی حفاظت انھی کی ڈیوٹی ہوتی ہے جس کی ادائیگی وہ پوری ذمے داری سے کرتے ہیں۔

"ہاتھی جب ایک جگہ سے دوسری جگہ سفر کرتے ہیں تو عموماً پورا قبیلہ آگے پیچھے ایک لائن بنا کر چلتا ہے۔ سب سے آگے کوئی بزرگ ہتھنی۔ اس کے پیچھے بچوں والی مائیں۔ ماؤں کے دائیں بائیں چھوٹے بچے لگے ہوئے، ان کے پیچھے قبیلے کا سردار، کسی بھی خطرے کا سامنا کرنے کے لیے پوری طرح چوکس۔ اور سردار ہاتھی کے پیچھے کچھ فاصلے کے ساتھ نوجوان اور نوعمر ہاتھیوں کی ٹولی ——— پیچھے اس لیے کہ کہیں ابا حضور ناراض ہو کر خواہ مخواہ کسی کے گھونسا نہ جڑ دیں ——— اگر منزل پر پہنچنے کی جلدی نہ ہو تو رفتار دس کلومیٹر فی گھنٹہ سے زیادہ نہیں، لیکن ہنگامی حالات میں ایک گھنٹے میں ۲۵ کلومیٹر آسانی سے طے کر لیں۔

"ہاتھی ——— چیتل، ہرن، سانبھر، نیل گائے کی طرح چوکڑیاں نہیں بھر سکتے اور نہ ہی زیبرے اور گھوڑے کی طرح سرپٹ بھاگ سکتے ہیں۔ ایک اور خاص بات یہ ہے کہ چلتے یا بھاگتے وقت ان کے جسم سے پیڑ پودوں کے ٹکرانے سے آوازیں ہوں تو ہوں، لیکن بھاری بھرکم جسم ہونے کے باوجود چلتے وقت ان کے پیروں سے ہلکی سی بھی آواز نہیں نکلتی۔ یہاں تک کہ اگر پیروں کے نیچے سوکھے پتے بھی آتے رہیں، تب بھی چُرمُر کی آوازیں نہیں ہوں گی، اور وزنی چلتے پیر پتوں کو کچلنے کے ساتھ ساتھ ان کی آوازوں کا بھی گلا گھونٹتے ہوئے آگے بڑھ جائیں گے ———"

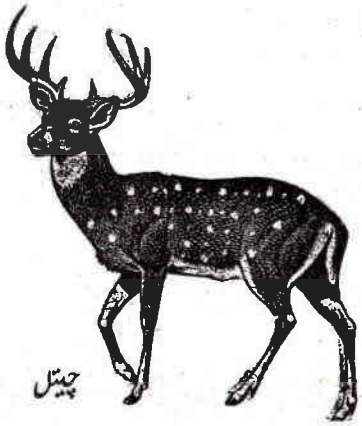

چیتل

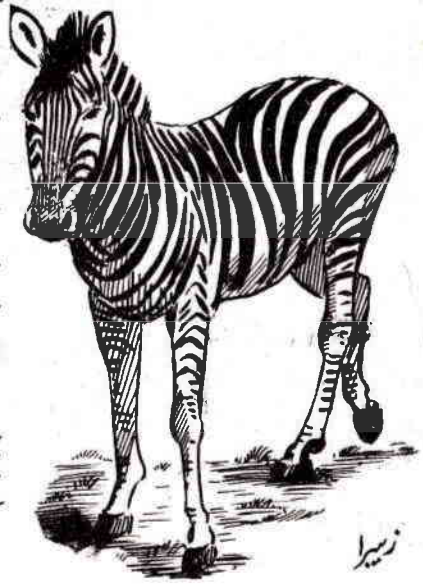

زیبرا

ہاتھیوں کی باتیں کرتے کرتے خاصا وقت بیت گیا۔ دن چھپنے میں ایک گھنٹے سے بھی کم وقت بچا تھا۔ وکیل صاحب جنگل سے ابھی تک واپس نہیں آئے تھے۔ اس تاخیر سے سب کو تشویش ہونے لگی اور مختلف اندیشے سر اُبھارنے لگے کہ کہیں وکیل صاحب کسی جھمیلے میں تو نہیں پڑ گئے۔ پھر یہ سوچ کر دل کو تسلی دینے کی کوشش کی گئی کہ ہو سکتا ہے انھوں نے کوئی بڑا جانور شکار کر لیا ہو جس کی وجہ سے انھیں واپسی میں دیر ہو رہی ہو۔ اور پھر اسی خیال کو درست سمجھتے ہوئے یہی فیصلہ ہوا کہ کچھ دیر اور انتظار کریں اور اگر وہ پھر بھی نہ آئے تو جنگل میں جا کر انھیں ڈھونڈا جائے۔

سورج غروب ہونے میں ابھی کچھ وقت باقی تھا، اس لیے اس وقت کا بہترین استعمال یہی سمجھا گیا کہ وہ لوگ جو بن کے باسیوں کو ان کو اپنے قدرتی

Visit for more best books www.pdfbooksfree.pk

ماحول میں چلتے پھرتے دیکھنے، اور ان کا قریب سے مشاہدہ کرنے میں دلچسپی رکھتے ہیں، وہ اتنی دیر کے لیے ندی پر اس جگہ چلے جائیں جہاں تھوڑا پانی جمع ہے۔ وہاں شام کے وقت پرندے اور جانور پانی پینے آیا کرتے ہیں۔

سیّد صاحب یہ تجویز سنتے ہی پھڑک اٹھے۔ وہ ایسے خوش ہوئے جیسے انھیں منہ مانگی مراد مل گئی ہو۔ اور یہ یقین کرتے ہوئے کہ اس مہم میں وہ تو شریک رہیں گے ہی، جلدی سے اپنی دوربین نکال ساتھ چلنے کو تیار ہو گئے۔ وہ جگہ جہاں چھپ کر جنگلی جانوروں کا تماشا دیکھنا تھا، بنگلے سے زیادہ دور نہ تھی۔ اس کے باوجود اس اصول کے پیش نظر کہ جہاں تک ہو سکے جنگل میں بغیر ہتھیار کے نہ جایا جائے، ایک صاحب نے اپنی رائفل بھی کندھے پر لٹکالی۔

جب سب لوگ خراماں خراماں چھپنے والی جگہ کی طرف بڑھ رہے تھے تو سیّد کو موقع ہاتھ آیا اور انھوں نے وقت سے فائدہ اٹھاتے ہوئے چچا جان سے وہ سوال پوچھ ہی لیا جو بنگلے کی طرف آتے ہوئے راستے میں پُلیا کے نیچے پانی دیکھ کر ان کے دماغ میں آیا تھا کہ آخر ایسا کیوں ہے کہ ندی میں کہیں کہیں تو اس طرح صاف پانی جمع ہے جیسے کوئی ہر روز آکر بھر جاتا ہے، جبکہ پوری ندی گرمی کی وجہ سے ایسی خشک پڑی ہے جیسے اس میں ایک زمانے سے پانی آیا ہی نہ ہو۔

چچا جان سیّد کے منہ سے یہ سوال سن کر خوش ہو گئے۔ کہنے لگے، اس کا مطلب ہے کہ تم جنگل کی رعنائیوں کو سرسری طور سے دیکھتے ہوئے نہیں گزر رہے، بلکہ غور سے ایک ایک چیز کا مشاہدہ کر کے نئی نئی باتیں سیکھنے کی کوشش کر رہے۔ یہ بڑی اچھی عادت ہے۔ سمجھ دار اور ناسمجھ میں یہی فرق ہے کہ سمجھ دار انسان میں تلاش و جستجو کا مادّہ ہوتا ہے، اس لیے وقت کے ساتھ ساتھ اس کی عقل اور معلومات میں اضافہ ہوتا جاتا ہے۔ ناسمجھ انسان کیوں اور کیسے کی فکر نہیں کرتا اس لیے وہ زندگی بھر بدّھو اور بے 'د' کا بودم بنا رہتا ہے

چچا جان نے سیّد کی اس طرح تعریف کرنے کے بعد خشک نالے میں کہیں کہیں پانی بھرا ہونے کی وجہ بتاتے ہوئے کہا کہ "تمہیں یہ بات تو معلوم ہو گی ہی کہ پیڑ پودے اگر ایک طرف ہمیں آکسیجن، یعنی وہ صاف ہوا فراہم کرتے ہیں جو ہم سانس کے ساتھ اندر کھینچتے ہیں اور جس کے بغیر ہم ایک منٹ بھی زندہ نہیں رہ سکتے، تو دوسری طرف ایک بہت بڑا فائدہ یہ بھی ہے کہ ان کی وجہ سے موسموں کا توازن بنا رہتا ہے۔ بارش کرانے اور زمین کو ریگستان میں تبدیل ہونے سے بچانے میں بھی پیڑ پودے اور جنگل بڑا رول ادا کرتے ہیں۔ یہ جنگل جہاں ہم گھوم رہے ہیں، ہمالیہ کا ترائی کا جنگل کہلاتا ہے۔ گھنے جنگلوں کا یہ طویل سلسلہ ملک کے شمال میں مشرق سے مغرب تک ہزاروں میل لمبی اور پچاسوں میل چوڑی پٹی کی صورت میں پھیلا ہوا ہے۔ انھی کی بدولت ملک کے بڑے حصّے میں، اور خاص طور سے اس کے شمالی حصّے میں خوب بارش ہوتی ہے۔ بارش کے پانی کا زیادہ حصّہ ان ندی نالوں سے ہوتا ہوا آگے جا کر بڑے دریاؤں میں جا ملتا ہے جو پتّے کی نسوں کی طرح ترائی کے جنگلوں میں پھیلے ہوئے ہیں۔ اس کا کچھ حصّہ جنگلات کی زمین اور پہاڑیاں بھی جذب کر لیتی ہیں اور یہی وہ پانی ہوتا ہے جو خشک نالے کے قریب یا ان سے کچھ دور واقع مٹّی اور پتھروں کے ملے جلے پہاڑوں سے سوتوں کی شکل میں زمین کے اندر ہی اندر رِستا ہوا خشک نالے کے کسی نرم حصّے میں جا نکلتا ہے۔ دہرادون، مسوری، نینی تال، ہرگدّا، اور لینس ڈاؤن کے راستے میں بھی جگہ جگہ سڑک سے لگی پہاڑیوں سے پانی کی دھاریں نکلتی ہوئی ملتی ہیں۔ ان جھرنوں سے گرمی کے موسم میں بھی عموماً ایک جیسی رفتار سے مسلسل ٹھنڈا میٹھا پانی گرتا رہتا ہے۔ وہ پانی بھی دراصل بارش کا ہی ہوتا ہے، جو برسات میں پہاڑوں میں جمع ہو جاتا ہے اور اس کے بعد اندر ہی اندر راستہ بناتا ہوا جہاں بھی جگہ مل جائے، باہر پھوٹ پڑتا ہے۔

"پانی نکلنے کی یہ تو ہوئی سائنسی وجہ لیکن سچ تو یہ ہے کہ اس طرح پانی نکلنے میں اللہ کے کرم کا ہی دخل ہے۔ خود ہی سوچو کہ اگر اللہ نے مٹّی اور پہاڑوں میں برسات کے پانی کو جذب کر کے بعد میں اُسے آہستہ آہستہ خارج کرتے رہنے کی صلاحیت نہ رکھی ہوتی تو جنگل کے جانوروں کو گرمی کے موسم میں پانی کہاں سے ملتا۔ یا اگر پانی کھلی نالیوں کے

Visit for more best books www.pdfbooksfree.pk

ذریعے بہا کرتا تو کیا وہ جلدی ختم نہ ہو جاتا۔ زمین کے اندر ہی اندر رہنے میں حکمت یہ ہے کہ وہ بھاپ بننے سے محفوظ رہ جاتا ہے اور اس طرح سخت گرمی کے موسم میں بھی جب کہ ندی نالوں میں پانی نہیں چلتا، اللہ کی رحمت سے تھوڑے تھوڑے فاصلے پر حاجت مندوں کو موتی کی طرح صاف ٹھنڈا میٹھا پانی مل جاتا ہے"۔

چچا جان یہ باتیں بتا ہی رہے تھے کہ اتنے میں کہیں قریب سے ایک کالے تیتر کے بولنے کی آواز سنائی دی۔ یہ تیتر ابھی ایک دو بار ہی بولا ہوگا کہ فوراً ہی اس کے کچھ فاصلے پر ایک اور کالے تیتر نے چٹخنا شروع کر دیا۔ پھر تو ایسا لگا جیسے ان میں بیت بازی کا مقابلہ ہونے لگا ہو۔ ایک بولتا تو دوسرا اسکا جواب دیتا۔ دوسرے کی آواز آتی تو پہلے کو جواب دینا ضروری ہو جاتا۔ جنگل میں یوں بھی کیا جانور اور کیا پیڑ پودے، ہر ایک شے پُرکشش ہوتی ہے۔ اور یہاں تو معاملہ تھا کالے تیتر کا، جس کی آواز میں ایسی جاذبیت، ایسی کشش اور کچھ ایسا جادو ہوتا ہے کہ کیسا ہی جانور بیزار کیوں نہ ہو، سنتے ہی اُس کی طرف متوجہ ہو جاتا ہے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ چلتے چلتے سب کے قدم خود بخود رک گئے اور اس خیال سے کہ ذرا دیکھیں تو، یہ حق اللہ کہنے والا کہاں ضربیں لگا رہا ہے، سب اس طرح خاموش کھڑے ہو گئے جیسے وہ جیتے جاگتے انسان نہیں، اسٹیچو ہوں۔

جہاں یہ لوگ رُکے تھے وہاں ایک طرف گھنا جنگل تھا اور اس سے دوسری طرف ایک کھلا میدان، جس میں پیڑ تو تھے، لیکن چھدرے اور وہ بھی چھوٹے چھوٹے۔ دونوں تیتر گھاس کے اسی میدان میں آوازوں کے زور پر ایک دوسرے پر برتری جتانے میں مصروف تھے۔ آخر ایک بار جیسے ہی ایک کالے تیتر نے گلا پھلا کر آواز نکالی تو اونچی گھاس کی چلمن کے پیچھے اس پر نظر پڑ ہی گئی۔ وہ زمین پر گرے ہوئے

ایک پیڑ کے تنے پر کھڑا ہوا تھا۔ تیتر نے کچھ دیر تو دیکھتے رہنے کا موقع دیا۔ پھر نہ جانے کیا بات ہوئی کہ اچانک اُس نے زمین کی طرف غوطہ لگایا اور پلک جھپکتے ہی نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ ظاہر ہے اس کے بعد تیتر کی باتیں تو ہونی ہی تھیں۔

انوار چچا بولے: سعید تمھارے خیال میں تیتر کیا کہہ رہا تھا۔ اچھا اس کی آواز کے بارے میں ایک کہانی سنو۔ تین دوست کہیں جا رہے تھے۔ ان میں ایک پہلوان تھا، دوسرا بنیا اور تیسرا ایک مولوی۔ راستے میں تیتر کے بولنے کی آواز آئی۔

مولوی صاحب بولے: دیکھو، تیتر کہہ رہا ہے ـــــ سُبحان تیری قدرت

بنیے نے کہا: نہیں، یہ کہہ رہا ہے ـــــ نون، تیل، ادرک

پہلوان نے کہا: نہیں، نہیں، یہ کہہ رہا ہے ـــــ ڈنڈ، بیٹھک، کسرت

سعید یہ کہانی سن کر مسکرا دیے۔ کہنے لگے، مجھے تو مولوی صاحب کی بات اچھی لگی۔

تیتروں کے بارے میں سعید کو پہلے ہی سے بہت سی باتیں معلوم تھیں، اس لیے کسی سے کچھ پوچھنے کی ضرورت نہ پڑی۔ سعید کو معلوم تھا کہ تیتر کئی طرح کے ہوتے ہیں جن میں کالا تیتر، بھورا تیتر اور بھٹ تیتر خاص طور سے مشہور ہیں۔ کالے تیتر کا قد دیسی مرغی کے برابر اور بھورے تیتر سے بڑا ہوتا ہے، جبکہ بھٹ تیتر سے بھورا تیتر کچھ چھوٹا اور لمبے جسم کا ہوتا ہے۔

کسی زمانے میں تیتر ہندستان کے تقریباً سبھی علاقوں میں کثرت سے ملتے تھے، لیکن دوسرے جنگلی جانوروں کی طرح اب ان کی تعداد بھی کم ہو گئی ہے، بلکہ کچھ علاقوں میں تو ان کی بعض نسلیں بالکل ہی ناپید ہو گئی ہیں۔ تیتر میدانی علاقے کا پرندہ ہے اس لیے گھنے جنگلوں میں صرف ایسی جگہوں پر ملتا ہے جہاں پیڑوں کے درمیان گھاس کے لمبے چوڑے قطعے ہوں یا آس پاس کہیں کھیتی باڑی ہوتی ہو۔

بھٹ تیتر کے مقابلے کالے اور بھورے تیتروں کے جسم گدرے اور دُمیں چھوٹی ہوتی ہیں۔ تیتروں کی ٹانگیں تیتری یا کرمانک (بٹیر سا) کی ٹانگوں کی طرح لمبی نہیں ہوتیں، اس کے باوجود وہ اپنی چھوٹی چھوٹی ٹانگوں سے کافی تیز بھاگ لیتا ہے۔ خطرے کا

Visit for more best books www.pdfbooksfree.pk

احساس ہونے پر وہ گھاس کے میدان یا کھیت میں اس طرح دبا دبا بھاگتا ہے کہ پاس ہوتے ہوئے بھی دکھائی نہیں دیتا۔ معمولی سی آڑ کے پیچھے اپنے آپ کو چھپا لینے میں تیتروں کو خاص مہارت حاصل ہے۔ اُگے ہوئے کھیت کی بات تو الگ رہی، وہ جُتے ہوئے کھیت میں جس میں نام کے لیے بھی پودا نہ ہو، مٹی کے ڈلوں میں اس طرح چھپ جاتا ہے کہ لاکھ کوشش پر بھی دکھائی نہیں دیتا۔

تیتر اپنا گھونسلہ زمین پر سوکھے پتوں اور گھاس کے تنکوں سے ملا کر بناتا ہے جو عام طور پر کھیت میں ہل چلنے سے بننے والی نالیوں میں کسی چھوٹے گڑھے کے اندر یا پھر گھاس کے میدان یا جھاڑیوں کی جڑ کے آس پاس پہلے سے موجود کسی گڑھے میں ہوتا ہے۔ اس کا گھونسلہ زمین سے اُبھرا ہوا نہیں ہوتا، اس لیے قریب سے گزر جانے پر بھی اس پر نگاہ نہیں پڑتی اور مادہ تیتر

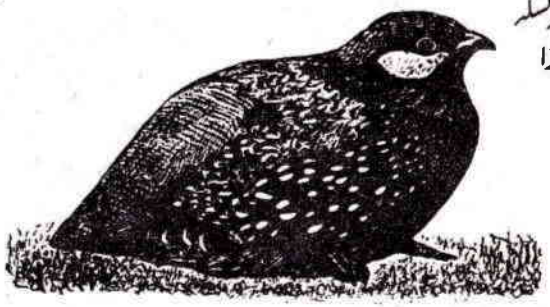

دوسروں کی نگاہوں سے چھپ کر اطمینان سے اپنے انڈوں پر بیٹھی رہتی ہے۔

بھورے تیتر کے انڈوں کا رنگ سبزی مائل پیلا اور کالے تیتر کے انڈوں کا ہلکا سبزی مائل بھورا ہوتا ہے۔ تعداد میں بھورے کے آٹھ سے بارہ اور کالے کے چھ سے آٹھ کے قریب انڈے ہوتے ہیں۔ مرغی کے بچوں کی طرح تیتر کے بچے بھی انڈوں سے نکلتے ہی بھاگنے دوڑنے لگ جاتے ہیں۔ لیکن چلنے پھرنے کے قابل ہونے کے باوجود ماں باپ بچوں کو کچھ دن کھیت سے باہر کھلے میدان میں نہیں لاتے، بلکہ کھیت کے اندر ہی کھانے کی چیزیں تلاش کر کے انھیں وہاں تک لے جاتے ہیں۔ ایسے میں

روئیں دار گول مٹول ننھے منّے بچے بڑے ہی خوبصورت لگتے ہیں اور جی چاہتا ہے کہ بس دیکھتے ہی رہیں۔

ہر ماں باپ کی طرح تیتر بھی اپنے چھوٹے بچوں کی بڑی دیکھ بھال کرتے ہیں۔ مادہ تیتر کا اگر کبھی کسی انسان یا ایسے جانور سے سامنا ہو جائے جس سے بچوں کو خطرہ ہو تو وہ منہ سے ایک تیز سیٹی کی آواز نکالتی ہے۔ یہ دراصل خطرے کی گھنٹی ہوتی ہے جسے سن کر بچے جہاں ہوں، اس جگہ سے ایک انچ بھی ہلے بغیر ایک دم زمین سے چپک کر اپنے آپ کو چھپا لیتے ہیں۔ اس کے بعد مادہ تیتر بچوں کو وہیں چھوڑ کر اس جگہ سے ہٹنا شروع کر دیتی ہے۔ وہ وہاں سے اُڑتی نہیں اور نہ ہی تیزی سے بھاگتی ہے۔ بلکہ اس طرح ظاہر کرتی ہے جیسے کمزور اور چوٹ کھائی ہوئی ہے۔ وہ اپنا بازو لٹکا کر دشمن کو یہ باور کرانے کی کوشش کرتی ہے کہ وہ زخمی ہے اور اُڑ نہیں سکتی۔ اور پھر نمایاں رہ کر اس رفتار سے ہٹتی ہے کہ وہاں جو کوئی بھی ہو، یہ سمجھے کہ اسے تو دوڑ کر پکڑا جا سکتا ہے۔ لیکن وہ کبھی پکڑے جانے کا موقع نہیں دیتی۔ اسی طرح جب دشمن کو اپنے پیچھے لگائے لگائے بچوں کی جگہ سے کافی دُور لے آتی ہے تو پھر اچانک پُھر سے اڑ کر دور چلی جاتی ہے۔ لیکن اپنے بچوں کو زیادہ دیر اکیلا نہیں چھوڑتی اور کچھ ہی دیر میں گھوم کر پھر وہیں آ جاتی ہے جہاں بچوں کو چھوڑا تھا۔ میدان صاف دیکھ کر ایک بار پھر اس کی تیز سیٹی ہوا میں گونجتی ہے اور فوراً ہی اِدھر اُدھر سے بھاگ بھاگ کر بچے اس کے پاس آ جاتے ہیں۔ شروع شروع میں چھوٹے بچوں کو دیمک اور چیونٹیوں کے انڈے کھلائے جاتے ہیں۔ اس کے بعد دیمک یا اس کے برابر دوسرے چھوٹے چھوٹے کیڑے۔ بعد میں بڑا ہونے پر وہ بھی اپنے ماں باپ کی طرح دیمک، کیڑے مکوڑے، پھلیوں کے بیج، دالیں اور اناج وغیرہ کھانے لگتے ہیں۔

کالا تیتر، بھورے تیتر کے مقابلے میں چونکہ ذرا بھاری جسم کا ہوتا ہے، اس لیے اُڑنے میں تکلف سے کام لیتا ہے اور خطرہ محسوس ہونے پر تیزی سے بھاگتا ہے۔ لیکن اگر ضرورت پڑے تو وہ اچھی اُڑان بھرتا ہے۔ فربہ جسم ہونے کی وجہ سے یہ اُڑان کبوتر، فاختہ یا ہریل کی طرح لمبی تو نہیں ہوتی، پھر بھی وہ مزے سے تقریباً تین سو میٹر کا فاصلہ طے کر ہی

Visit for more best books www.pdfbooksfree.pk

لیتا ہے۔ تیتروں کی ایک خاص عادت یہ بھی ہے کہ جس جگہ اُڑ کر اترتے ہیں، وہاں نہیں رُکتے، بلکہ اترنے کے بعد تیزی سے بھاگ کر اس جگہ سے کافی دور نکل جاتے ہیں۔

ہریل

جس طرح مُرغ زور زور سے بانگ دے کر اپنے ہم جنسوں پر برتری ثابت کرنے کی فکر میں رہتے ہیں، اسی طرح نر تیتر بھی عموماً صبح و شام کافی دیر تک آوازوں کا مقابلہ کر کے جنگل میں ارتعاش پیدا کرتے رہتے ہیں۔ انڈے بچے نکالنے کے زمانے میں اس مقابلے میں اور بھی شدت آ جاتی ہے۔ نر کالے تیتر کی آواز چک — چیک — چیک — کری — آ — کاک — جیسی ہوتی ہے جو کانوں کو بہت بھلی معلوم ہوتی ہے۔

نالے کا پانی جب سو سوا سو گز دور رہ گیا تو للتا نا کی ایک گھنی جھاڑی میں سب لوگ سمٹ سمٹا کر بیٹھ گئے۔ یہ جھاڑی پانی کی سطح سے کچھ اونچائی پر تھی۔ وہاں انھوں نے ٹہنیوں اور پتّوں کی اس طرح آڑ کھڑی کر لی کہ خود تو باہر سے دکھائی نہ دیں، لیکن ٹہنیوں کے جھروکے سے اپنے آپ باہر کی دنیا کا نظارہ کرتے رہیں۔ جس وقت جھاڑی میں چھپنے کے لیے جگہ بنائی جا رہی تھی، اس وقت پہلے ہی سے بندروں کا ایک خاندان پانی کے قریب مورچہ سنبھالے ہوئے تھا۔ بندروں نے ان لوگوں کو دیکھا مگر ان سے ڈر کر بھاگ جانے کی ضرورت نہ سمجھی۔ انھوں نے صرف اتنا کیا کہ وہاں سے کھسک کر آگے بڑھ گئے، لیکن رہے نظروں کے سامنے ہی۔ سیّد نے دیکھا کہ اس وقت کچھ بڑے بندر پیڑوں پر براجمان تھے تو کچھ زمین پر اُگی خود رو بیلوں اور پودوں سے پھول اور کلیاں نوچ نوچ کر کھانے میں لگے تھے۔ سیّد نے یہ بھی دیکھا کہ بندروں کے بہت چھوٹے بچّے اپنی ماؤں کے سینوں سے چمٹے ہوئے تھے تو ان کے بڑے بچّے بے فکری سے کودنے پھاندنے اور کھیل کھیل میں ایک دوسرے کو دھکیلنے، کُشتیاں لڑنے اور دُمیں کھینچنے میں مگن تھے۔

بندروں کا تماشا ابھی چل ہی رہا تھا کہ اتنے میں پیڑوں کی آڑ سے کچھ فاصلے پر ایک کے بعد ایک، چار مور نکل کر سامنے آ گئے۔ ان میں تین مورنیاں تھیں اور ایک نر مور جس کی دُم زیادہ لمبی نہ تھی۔ موروں نے کھلے میدان میں آنے سے پہلے ہی بندروں کو دیکھ لیا ہوگا، مگر ان سے کسی قسم کا خطرہ نہ تھا اس لیے نہایت اطمینان سے اِدھر اُدھر چونچیں مارتے ہوئے خراماں خراماں پانی کی طرف بڑھ رہے تھے۔

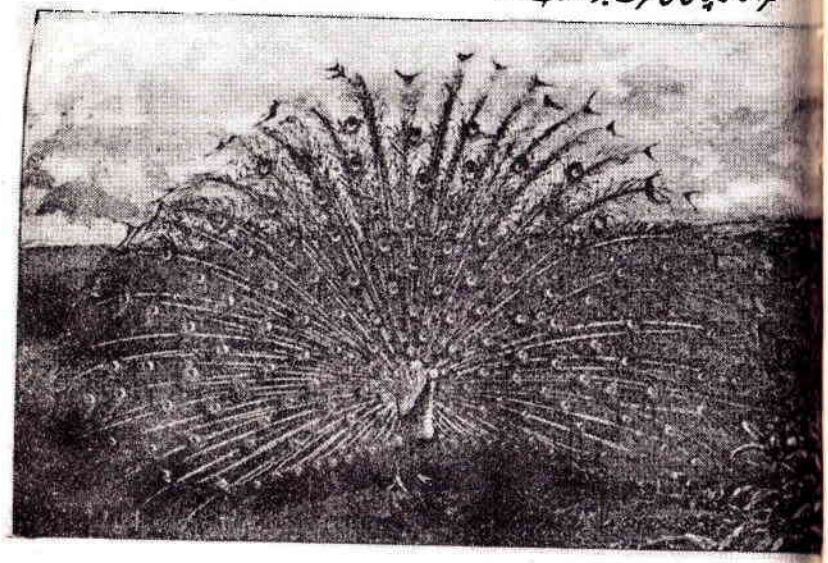

چاروں مور ابھی پانی تک پہنچے نہ تھے کہ ایک چوتھا مور بھی اُن میں آ ملا۔ یہ لمبی دُم والا نر مور تھا جو قریب کے ایک پیڑ پر بیٹھا ہوا تھا۔ اس نے زمین پر اترتے ہی اپنے پر پھیلا کر ناچنا شروع کر دیا۔ دیکھتے ہی دیکھتے اس کے خوش نما پَر چھتری کی طرح پھیلے اور اپنے حسین و دلفریب نقش و نگار کے ساتھ ایک ایسا منظر پیش کرنے لگے جس کی صحیح اور مکمل تصویر الفاظ میں کھینچی نہیں جا سکتی۔ اس وقت یوں لگ رہا تھا جیسے کسی نے بے شمار ہیرے تراش کر اس کی دُم میں لگا دیے ہیں اور پَروں کی جگہ مور کے جسم پر گہرے سبز، کالے

Visit for more best books www.pdfbooksfree.pk

جھورے، سنہرے اور نیلے رنگ کی ایک چھوٹی قوسِ قزح نکل آئی ہے۔ کبھی ایسا محسوس ہوتا کہ اس کے لمبے لمبے ریشمیں نیلگوں پروں میں ایک ساتھ درجنوں آنکھیں نکل آئی ہیں جو پھٹی پھٹی نظروں سے شاید اس لیے حیرت سے دیکھ رہی ہیں کہ چاروں طرف بکھرے قدرت کے لازوال حُسن کو کس طرح سمیٹا جائے۔ خود مور پر بھی اس وقت ایک وجد کی کیفیت طاری تھی اور وہ پَروں کو ساز کی طرح بجاتا ہوا جھوم جھوم کر کبھی قدم آگے بڑھاتا تھا اور کبھی پیچھے۔ اس وقت مور نیاں بھی نر مور کا دل بڑھانے کے لیے اُس کے آس پاس آگئی تھیں۔

کچھ دیر تک یہ دلفریب منظر پیش کرتے رہنے کے بعد مور نے آہستگی سے اپنے پھیلے ہوئے پر سمیٹ لیے۔ پروں کو سمیٹتے ہی ماحول پر چھائی ہوئی سحر انگیز کیفیت بھی ختم ہو گئی۔ سیّد نے سوچا کہ مور کو اپنے ملک کا قومی پرندہ ٹھیک ہی بنایا گیا ہے۔ حسن اور خوبصورتی میں کوئی اور پرندہ مور کا مقابلہ کر ہی نہیں سکتا۔ سیّد کو اس وقت کسی کتاب میں سے پڑھا ہوا ایک مضمون یاد آگیا۔ جس میں بتایا گیا تھا کہ دنیا میں سات سے زیادہ اقسام کے مور پائے جاتے ہیں جو عام طور پر نیلے، سبز، سفید اور سیاہ رنگوں کے ہوتے ہیں۔ ہندستان میں زیادہ تر نیلا مور ہی ملتا ہے جو اپنے حُسن، رعنائی اور دل کشی میں سب سے بڑھ چڑھ کر اور اپنی مثال آپ ہے۔ سفید مور بھی اپنے ہاں ہوتے ہیں، لیکن بہت کم اور وہ بھی کہیں کہیں صرف ہمالیہ کے جنگلوں میں۔

ہندستان کے علاوہ نیلا مور سری لنکا اور جاپان میں بھی پایا جاتا ہے۔ نیلے نر مور کی چونچ کالی، آنکھوں کے اوپر اور نیچے اُبھری ہوئی سفید کھال اور سر کے اوپر چمکدار نیلے رنگ کا تاج۔ گردن کے پروں میں نیلے اور سبز رنگ کا شیڈ، بازوؤں کے پَر ہلکے براؤن اور کالی لہروں والے۔ کمر کے پَر بازوؤں کے پَروں سے کہیں زیادہ خوبصورت اور لمبے لمبے جن کے آخری سروں پر نئے چاند کی شکل کی پتّیاں۔ ان پتّیوں کے نیچے سنہرے، سبز اور نیلے رنگوں میں سیب کی شکل کے گول چاندے۔ لمبے رنگین پروں کے نیچے سہارے کے لیے سیاہ رنگ کے مضبوط پَر جو ناچتے وقت بھی بڑے پروں کو سہارا دینے کے کام آئیں۔

نر اگر پورا جوان ہو تو دُم کی لمبائی چھ فٹ کے قریب، جو تین سال کی عمر میں اپنی

پوری لمبائی کو پہنچتی ہے۔ مادہ مور کی دُم نر مور کی طرح خوبصورت نہیں ہوتی۔ اس کے پروں کا رنگ بھی نر کی طرح چمکدار نہیں ہوتا۔ اگر انڈے بچّے ضائع نہ ہوں تو مادہ عموماً سال میں ایک بار ہی انڈے دیتی ہے۔ انڈے دینے کا زمانہ مارچ سے جون تک رہتا ہے۔ انڈے سینے کے کام میں دوسرے پرندوں کی طرح مادہ کو نر سے کوئی مدد نہیں ملتی۔ کسی طرح کی بیماری نہ لگے تو مور پچاس سال تک زندہ رہتا ہے۔ موروں کی ایک خوبی یہ بھی ہے کہ وہ انسانوں سے جلد مانوس ہو جاتے ہیں اور پالتو کبوتروں اور مرغیوں کی طرح کُھلا رکھ کر گھروں میں آسانی سے پالے جا سکتے ہیں۔ پالتو مور کو اگر ہاتھ سے کھانا کھلانے کی عادت ڈال دی جائے تو پھر کسی بچّے کی طرح مالک کے ہاتھوں سے ہی کھانا پسند کرتا ہے، اور کہیں بھی ہو گھوم پھر کر کھانے کے وقت مزدر گھر واپس آجاتا۔

سیّد نے دیکھا کہ صرف ایک مورنی پانی پینے کے لیے گڑھے کے پاس آئی باقی موروں کو شاید پیاس نہ لگی تھی یا وہ کہیں اور پی چکے تھے اس لیے وہ پانی پر نہیں آئے۔ مورنی کے پانی پینے کا انداز ٹھیک اسی طرح تھا جیسے مرغ مرغیاں پانی پیتے ہیں۔ وہ پانی میں چونچ ڈالتی اور جتنا پانی دونوں چونچوں کے درمیان رُک جاتا، اسے گردن اونچی کر کے حلق میں اتار لیتی۔ پانی پینے کے بعد یہ بھی اپنے ساتھیوں سے جا ملی اور ان کی طرح چھوٹے چھوٹے گھونگے اور دوسرے کیڑے مکوڑے زمین سے چُن چُن کر کھانے لگی۔

موروں کو دیکھتے دیکھتے سیّد کو اچانک ان بندروں کا خیال آیا جن پر ان کی نگاہ جھاڑیوں میں بیٹھتے ہی پڑی تھی، لیکن موروں کے آجانے کے بعد ان کی طرف سے توجہ ہٹ گئی تھی۔ بندر دکھائی نہیں دیے۔ وہ اس دوران وہاں سے کھسک کر جنگل میں داخل ہو چکے تھے۔ جنگل میں کچھ فاصلے پر ایک جگہ کچھ اونچے اونچے پیڑ دکھائی دے رہے تھے۔ سیّد نے سوچا کہ بندر انھیں پیڑوں کی

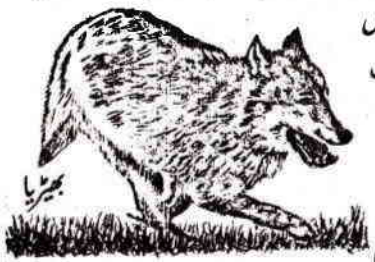

Visit for more best books www.pdfbooksfree.pk

طرف گئے ہوں گے کیوں کہ وہ شیر اور بھیڑیے جیسے گوشت خور جانوروں سے بچنے کے لیے اونچے پیڑوں پر ہی رات بسر کرتے ہیں۔

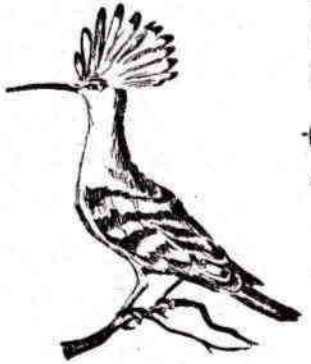

مور بڑے اطمینان سے کھانے میں لگے تھے کہ اچانک نہ جانے کیا بات ہوئی، ان میں بھگدڑ سی مچ گئی۔ ایک مور گھبرا کر اڑا اور قریب کے ایک پیڑ پر جا بیٹھا اور باقی مور گردن اٹھائے تیزی سے بھاگتے ہوئے جنگل میں داخل ہو گئے۔ ان کے انداز سے لگ رہا تھا کہ انھیں کسی خطرناک جانور کے آنے کا پتا چل گیا ہے، جس سے بچنے کے لیے وہاں سے ہٹ گئے ہیں۔ لیکن ایک ہُدہُد جو گڑھے کے پاس والی زمین میں جگہ جگہ سوراخ کرتا ہوا کیڑے تلاش کرتا پھر رہا تھا، اپنی جگہ ڈٹا رہا اور وہاں سے اڑنے کی ضرورت نہ سمجھی۔ جنگل کے سبھی جانوروں کی یہ خاصیت ہے کہ وہ ایک دوسرے کی آوازوں اور حرکتوں سے نہ صرف یہ کہ دوست دشمن کا پتا رکھتے ہیں، بلکہ یہ بھی سمجھ جاتے ہیں کہ خطرہ کہاں اور کس طرف ہے۔ موروں کے اس طرح بھاگنے سے ہُدہُد نے بھی ضرور اندازہ لگایا ہو گا کہ کوئی نہ کوئی خطرے کی بات ہے۔ مگر اس نے بھاگ جانے کی شاید اس لیے ضرورت نہ سمجھی کہ ہلکا پھلکا جسم ہے، جب دیکھوں گا کہ سچ مچ خطرہ قریب ہے تو پلک جھپکتے ہی پھر سے اڑ جاؤں گا۔ اس نے موروں کے بھاگنے پر تاج کے پروں کو دو ایک بار آگے پیچھے کیا، گردن اونچی کر کے آس پاس نگاہ ڈالی اور شاید یہ اطمینان کر لینے کے بعد کہ فوری طور پر کوئی خطرہ نہیں ہے، وہ پہلے کی طرح زمین سے کیڑے نکال نکال کر کھانے میں مشغول ہو گیا۔ موروں کے بھاگ جانے کے بعد سے سب کی تجسس بھری نگاہیں سامنے لگی تھیں، لیکن وہاں جو کوئی بھی تھا، سامنے نہیں آ رہا تھا۔ انتظار

ہُدہُد

کی گھڑیاں طویل سے طویل تر ہوتی گئیں۔ سیکنڈ منٹ کے برابر لگنے لگا اور منٹ کی مدّت گھنٹہ دکھائی دینے لگی ——— آخر خدا خدا کر کے تبدیلی آئی اور پانی کے قریب کی گھاس میں ہلچل شروع ہوئی۔ کوئی نرکل جیسی اونچی گھاس میں چل رہا تھا۔ ہُدہُد کو بھی، جو اطمینان سے زمین کی نرائی کرنے میں مگن تھا، خطرے کا احساس ہوا۔ وہ منہ سے ——— کھیک ——— کھیک ——— کرتا ہوا اُڑا اور پاس کے پیڑ کی ایک ڈالی پر جا کر بیٹھ گیا۔

سیّد نے اس خیال سے کہ ذرا معلوم تو کروں بات کیا ہے، پاس بیٹھے ہوئے عالم چچا کو دیکھا۔ عالم چچا کے چہرے پر پسینے کی ننھی ننھی بوندیں چمک رہی تھیں اور وہ پھٹی پھٹی نظروں سے ایک ٹک گھاس کی طرف دیکھے جا رہے تھے۔ عالم چچا کی حالت دیکھ کر سیّد بھی گھبرا گیا۔ اور جب اس نے پلٹ کر محبوب چچا کی طرف نظریں گھمائیں تو اس کے رہے سہے اوسان بھی جاتے رہے۔ محبوب چچا نے اپنا پیٹ پکڑ رکھا تھا اور مارے خوف کے ان کے ماتھے کی رگیں پھول کر موٹی موٹی لکیروں کی طرح ابھر آئی تھیں۔ اب تو سیّد کے بھی پسینے چھوٹنے لگے۔

کہیں کوئی شیر تو پانی پر نہیں آ رہا ——— ؟ ——— اب کیا ہو گا ——— ؟

شیر ہمارا قومی جانور ہے اس پر تو گولی بھی نہیں چلائی جائے گی ——— تو کیا رائفل کا فائر کر کے اسے بھگانے کی کوشش کرنا ہوگی ——— ؟ اور اگر فائر کی آواز سن کر اسے غصہ آگیا تو ——— ؟ سیّد کی آنکھوں میں شیر کی تصویر گھوم گئی۔ منہ پھاڑے ایک خوفناک شیر کی خیالی تصویر۔ انگاروں کی طرح دہکتی اور شعلے برساتی آنکھیں۔ خنجر کی طرح تیز دھار والے لمبے لمبے دانت۔ ایسا مضبوط جبڑا کہ پتھر بھی منہ میں آجائے تو چبا کر ریزہ ریزہ کر دے۔

Visit for more best books www.pdfbooksfree.pk

شیر کا تصور شاید کچھ دیر اور پریشانی میں مبتلا رکھتا کہ اچانک وہ گھاس سے باہر نکل آیا۔ اُسے دیکھتے ہی سب کے منہ سے بے اختیار "—— ارے ——" کی آواز نکلی اور اسی کے ساتھ آناً فاناً خوف و ہراس کی وہ کیفیت بھی ختم ہوگئی جس نے انھیں کچھ دیر کے لیے جان لیوا ہیجان میں مبتلا کر دیا تھا۔ وہاں کوئی شیر نہیں تھا —— ایک لومڑی تھی —— وہی لومڑی جسے قصّے کہانیوں میں ہمیشہ انتہائی عیّار اور چالاک جانور کی صورت میں پیش کیا جاتا ہے۔

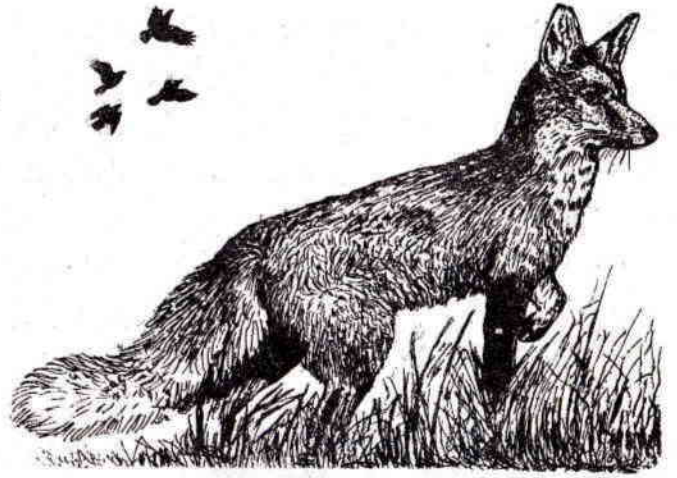

لومڑی آگے بڑھی جب پانی دو تین فٹ دور رہ گیا تو چلتے چلتے رُکی اور کُتّے کی طرح اگلے دونوں پنجوں سے زمین کھُرچنے لگی۔ ذرا سی دیر میں اُس نے اتنی زمین کھرچ ڈالی کہ گیلی مٹّی نکل آئی۔ پھر وہ کُتّے ہی کی طرح اگلے دونوں پیر آگے کی طرف پھیلا کر اسی گیلے گڑھے میں بیٹھ گئی۔ یہ لومڑی اکیلی نہ تھی۔ اس کے بیٹھتے ہی ایک اور لومڑی بھی گھاس سے نکل آئی۔ لیکن اس نے زمین نہیں کھرچی۔ بلکہ سیدھی گڑھے پر

پہنچی اور پانی میں اُتر گئی۔ اسے شاید پہلے والی سے کچھ زیادہ ہی گرمی ستا رہی تھی۔ پانی میں پہنچ کر اُس نے بچوں کی طرح چھینٹے اُڑانے شروع کر دیے۔ وہ کبھی سر کو پانی میں ڈبو کر جھٹکے دیتی تو کبھی پانی میں اس طرح بیٹھ جاتی کہ ناک اور کانوں کے علاوہ پورا جسم چھُپ جاتا۔ لیکن جس طرح اس نے پانی میں جانے میں جلدی دکھائی تھی، اسی طرح پانی سے باہر آنے میں بھی تیزی دکھائی۔ جلدی جلدی دو چار غوطے لگانے کے بعد وہ پانی سے باہر نکل آئی۔ گیلے جسم کو جھُرجھُری لے کر جھٹکا اور پھر فوراً ہی اسی گھاس میں روپوش ہوگئی جس سے ... کچھ دیر پہلے وہ باہر آئی تھی۔ اس دوران پہلی والی بھی پانی پر پہنچ چکی تھی۔ اس نے صرف اتنا کیا کہ اگلے دونوں پیر پانی میں رکھے اور کنارے پر رہ کر ہی کُتّے کی طرح زبان نکال کر لپ لپ پانی پیا اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے وہ بھی اپنے جوڑے کے پیچھے چلتی ہوئی نظروں سے اوجھل ہوگئی۔

لومڑیوں کے چلے جانے کے بعد عالم چچا نے انھی کی باتیں شروع کر دیں۔ اس وقت وہ بہت ہی دھیمے لہجے میں بول رہے تھے۔ اگر وہ یہ احتیاط نہ کرتے تو ان کی آواز دوسرے جانوروں تک پہنچ سکتی تھی، اور تب کوئی بھی وہاں پانی پینے نہ آتا۔ انھوں نے کانا پھوسی کے انداز میں جو باتیں بتائیں، وہ کچھ اس طرح تھیں:

"لومڑیاں تقریباً پوری دنیا میں پائی جاتی ہیں۔ لیکن یہ سب ایک جیسی نہیں ہوتیں۔ موسموں اور آب و ہوا کے اعتبار سے ان کے بالوں کے سائز، بالوں کی رنگت، قد اور شکلوں میں فرق ہوتا ہے۔ اسی بنیاد پر لومڑیوں کی بہت سی قسمیں بتائی گئی ہیں۔ حیوانات کی سائنس کے مطابق یہ کتّے کی نسل سے تعلق رکھتی ہیں۔ یعنی اس نسل سے جس میں جنگلی کتّے، گیدڑ، بھیڑیے اور لکڑ بھگّے (چرخ) آتے ہیں۔ اس کے باوجود دیکھنے میں نہ یہ کتّے جیسی ہوتی ہیں اور نہ بھیڑیے اور گیدڑ جیسی، بلکہ کوئی الگ ہی نسل معلوم ہوتی ہیں۔ مثلاً لومڑی کی تھوتھنی کتّے کی نسل کے دوسرے جانوروں کی طرح لمبوتری نہیں ہوتی دوسرے جانوروں کی ٹانگیں ان کے جسموں کے مطابق ہوتی ہیں، لیکن لومڑی کی ٹانگیں اس کے جسم کے تناسب سے ذرا چھوٹی ہوتی ہیں۔ اس نسل کے دوسرے جانوروں کے برعکس لومڑی

Visit for more best books www.pdfbooksfree.pk

کی دُم بھی لمبی اور گچھے دار ہوتی ہے۔ ایک اور اہم فرق اس کی آنکھوں کا ہے۔ لومڑی کی آنکھ کی پتلیاں بلّی جیسی ہوتی ہیں جو دن میں سکڑ جاتی ہیں اور رات یا اندھیرا ہو تو پھیل جاتی ہیں۔ یہ خوبی اس نسل کے دوسرے جانوروں میں نہیں ملے گی۔ شکل وصورت اور چال ڈھال میں بھی لومڑیاں جنگلی کتوں، بھیڑیوں، گیدڑ اور لکڑ بھگے کے مقابلے ذرا اچھی شکل کی ہوتی ہیں۔ ایک بات اور، جنگلی کتے اور گیدڑ غول بنا کر رہتے ہیں، لیکن لومڑیاں تنہائی پسند ہیں۔ یہ تو ممکن ہے کہ نر اور مادہ مل کر شکار کریں یا اگر بڑے بچے ہیں تو ایک آدھ بار انھیں بھی ساتھ رکھ لیں، لیکن عام حالات میں وہ شکار بھی تنہا کرتی ہیں اور شکار ہو یا دشمن سے مقابلہ، وہ ایک دوسرے کی مدد نہیں کرتیں۔

لومڑی بھی خرگوش کی طرح اپنا بل زمین کے اندر بناتی ہے۔ اس کے بل میں بھی آنے جانے یا خطرے کے وقت نکل بھاگنے کے لیے بہت سے منہ ہوتے ہیں۔ اس طرح کے بل خود محنت کر کے بھی بنائے جاتے ہیں اور موقع مل جائے تو خرگوش وغیرہ کے پہلے سے بنے بنائے بل پر قبضہ کر کے بھی تیار کیے جا سکتے ہیں۔ دن کی روشنی میں آنکھیں چُندھیاتی ہیں، اس لیے وہ زیادہ تر رات کو ہی شکار کے لیے باہر نکلتی ہیں ہاں اگر بھوک نے زیادہ پریشان کیا، خاص طور سے اس زمانے میں جب دودھ پینے والے بچے ہوں تو مجبوراً دن میں بھی شکار کی تلاش میں باہر نکل آتی ہیں۔ لومڑیاں ایک بھول میں تین سے آٹھ تک بچے دیتی ہیں۔ کتے بلّی کے بچوں کی طرح لومڑی کے بچوں کی آنکھیں بھی پیدائش کے وقت بند ہوتی ہیں جن کے کھلنے میں چھے سات دن لگ جاتے ہیں۔ لومڑی کی آواز کیسی ہوتی ہے، اسے لفظوں میں بتانا مشکل ہے۔ زیادہ سے زیادہ یہی کہا جا سکتا ہے کہ اس کی آواز بھدّی اور بے سُری ہوتی ہے۔ ایسی آواز جس میں بھونکنے، چلّانے، ہنسنے، رونے اور کھانسنے، بلکہ یہاں تک کہ خوفزدہ کرنے کی ملی جلی کیفیتیں پائی جاتی ہوں۔

لومڑیوں کی قوتِ شامّہ، یعنی سونگھنے کی طاقت بہت تیز ہوتی ہے۔ یہی حال سننے اور دیکھنے کا ہے۔ خطرے کا احساس ہوتے ہی بچاؤ کے لیے جھٹ پٹ فیصلہ

اور آناً فاناً اس پر عمل کرنے میں کوئی اور جانور اس کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ شاید انھی خوبیوں کی وجہ سے لومڑی کو ایک فریبی اور چالاک جانور بتایا جاتا ہے۔ بلاشبہ یہ ان روایتوں کی اہل بھی ہے۔ دبے پاؤں حرکت کرنا، تیز بینائی اور سب سے زیادہ اس کی ذہانت اور جلدی فیصلہ کرنے کی قوت، یہ سب ایسی باتیں ہیں جن سے لومڑیاں انتہائی خطرناک حالات میں بھی، جن میں بظاہر جان بچانا ممکن نہ ہو، اکثر اپنے آپ کو بچا لینے میں کامیاب ہو جاتی ہیں۔

ایک بار کا قصہ ہے کہ کچھ 'گرے ہاؤنڈ'، شکاری کتے ایک لومڑی کا پیچھا کر رہے تھے، لومڑی کھلے میدان کی طرف جانے کے بجائے باغ کی فصیل (دیوار) کی طرف بھاگی خیال ہوا کہ اب تو یہ کسی حالت میں نہیں بچے گی۔ لومڑی بھاگتے بھاگتے دیوار کے پاس آئی اور اچھل کر اس سے پار ہو گئی۔ کتے بھی دوڑتے دوڑتے اُچھلے اور وہ بھی دیوار کے پار ہو گئے۔ لیکن لومڑی نے حرکت یہ کی کہ وہ دیوار کے پار جا کر آگے نہیں گئی بلکہ ٹھیک اسی لمحے جب کتے دیوار پار کر رہے تھے، دوبارہ اُچھلی اور پھر واپس اسی جگہ آ گئی جہاں سے اس نے پہلی بار دیوار پار کرنے کے لیے چھلانگ لگائی تھی۔ دیوار کے اُس طرف کتوں کو سنبھلنے، بدلی ہوئی صورت حال کو سمجھنے اور پھر دوبارہ اُچھل کر دیوار پار کرنے میں کچھ وقت تو لگنا ہی تھا، اور اسی وقت نے جو چند سکنڈ سے زیادہ نہ رہا ہوگا، لومڑی کی جان بچا دی۔ کتے واپس پلٹے اور دوبارہ لومڑی کا پیچھا کرنے کے لیے ایک سمت بھاگے۔ لیکن اتفاق سے انھوں نے لومڑی کی وہ بُو پائی جو دیوار کی طرف آتے وقت پہلی بار اس کے پنجوں نے چھوڑی تھی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ دس بیس گز نکل جانے کے بعد جب کتوں کو غلطی کا احساس ہوا تو کافی دیر ہو چکی تھی۔ ظاہر ہے کہ اس کے بعد دوبارہ لومڑی کا سُراغ پانے کا سوال ہی نہ تھا۔

لومڑی کی ذہانت کا ایک اور آنکھوں دیکھا واقعہ اس طرح ہے کہ ایک کسان گرمی کے موسم میں اپنے کمرے کی کھڑکی سے باہر کا نظارہ کر رہا تھا۔ اس نے دیکھا کہ ایک لومڑی اس کے کھیت میں جا رہی ہے۔ لومڑی کے منہ میں ایک بڑی بطخ دبی ہوئی تھی۔ جدھر لومڑی منہ اٹھائے

Visit for more best books www.pdfbooksfree.pk

جارہی تھی، اُدھر پتھروں سے بنی کوئی چار فٹ کی اونچی دیوار تھی۔ بی لومڑی نے اپنے وزنی شکار کو منہ میں لیے لیے دیوار کو پار کرنا چاہا، لیکن ناکام رہی اور کمر کے بل کھیت میں گر پڑی۔ اس طرح تین بار کوشش کی اور ہر بار ناکام ہوئی۔ تھک ہار کے وہ زمین پر بیٹھ گئی۔ شکار بھی زمین پر رکھ دیا۔ کچھ دیر دیوار کو غور سے دیکھا۔ پھر جیسے کسی اطمینان بخش فیصلے پر پہنچ گئی ہو، اٹھی اور بطخ کو کمر سے پکڑنے کے بجائے اس کی گردن منہ میں دبائی اور اسے گھسیٹتے ہوئے دیوار تک لے آئی۔ اگلے دونوں پنجے دیوار پر ٹکائے اور پچھلے پنجوں پر جتنی اونچی اٹھ سکتی تھی، اٹھ کر بطخ کا سر دیوار کے ایک سوراخ میں داخل کر دیا۔ بطخ کو دیوار میں اٹکانے کے بعد اُچھل کر دیوار پر چڑھی پنجوں سے دیوار کو تھام کر لٹکتی ہوئی بطخ کو گردن سے پکڑا، اُسے اوپر گھسیٹا اور پھر پہلے کی طرح کمر کے پاس سے اسے منہ میں بھر کر اطمینان سے دیوار کے اس طرف کود گئی۔

لومڑی کی ذہانت کے قصے شاید کچھ دیر اور چلتے کہ اچانک ایک نیل گائے نے اگر باتوں کا سلسلہ رُکوا دیا۔ وہ اس طرح دبے پاؤں وہاں پہنچی تھی کہ کسی کو اس کے آنے کی آہٹ نہ ملی۔ پہلی بار جب اس پر نگاہ پڑی تو وہ پانی سے دور ایک پیڑ کی آڑ میں اس طرح کھڑی تھی کہ اس کا صرف اگلا دھڑ دکھائی دے رہا تھا۔ اس حالت میں وہ دو تین منٹ کھڑی رہی۔ پھر شاید یہ اطمینان کر لینے کے بعد کہ آس پاس کوئی خطرے کی بات نہیں ہے، اس نے قدم بڑھائے اور چلتی ہوئی کھلی جگہ میں آگئی۔ اس کے انداز سے لگ رہا تھا کہ وہ پانی تک آنے میں انتہائی احتیاط سے کام لے رہی ہے۔ کھلی جگہ میں آنے کے باوجود، وہ سیدھی پانی پر نہیں گئی، بلکہ پہلے کی طرح پھر ساکت کھڑی ہو کر خطرے کی سُن گُن لینے لگی۔ اور جب پوری طرح اطمینان کر لیا کہ میدان صاف ہے، وہ رُک رُک کر چلتی ہوئی پانی پر جا پہنچی۔ اس نے ابھی پانی پینا شروع نہ کیا تھا کہ اسی پیڑ کے پیچھے کچھ ہلچل ہوئی جس کے پاس اُسے پہلے دیکھا گیا تھا۔ اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے پیڑوں کی اوٹ سے نیل گایوں کا ریوڑ کا ریوڑ نکل کر سامنے آگیا۔ انھیں پہلی والی نیل گائے سے یہ سگنل مل ہی گیا تھا کہ چلی آؤ خطرہ نہیں ہے، اس لیے وہ سب کی سب بے جھجک

ایک دم پانی پر جا پہنچیں اور اس وقت تک پانی سے منہ نہ ہٹایا جب تک کہ خوب شکم سیر نہ ہو گئیں۔

وہ تعداد میں نو تھیں۔ چھوٹی بڑی پانچ مادائیں، تین بچے اور ایک نر۔ پانی پینے کے بعد بچھڑوں کی طرح نیل گائے کے بچوں نے اُچھل کود شروع کر دی۔ سیّد ان کا تماشا دیکھنے میں مگن تھے کہ مچھروں کو منہ کا مزہ بدلنے کا موقع مل گیا۔ ایک نے ان کے کان پر انجکشن لگایا تو دوسرا نہایت بے تکلفی سے سیدھا گال پر جا اُترا۔ ایک مچھر تو بہت ہی بدتمیز نکلا اس گستاخ کو سیّد کی ناک اچھی لگی اور لگا بیٹھتے ہی اپنے ڈنک کا برما چلانے۔ جب دشمن ایک ساتھ تین مورچوں پر حملہ کر دے تو کون ایسا ہوگا جو بزدل بنا بیٹھا رہے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ بے اختیار اُن کا پھیلا ہوا ہاتھ اُٹھا اور چٹاخ کی زوردار آواز کے ساتھ کان اور گال کے مچھروں کو کچلتا ہوا گزر گیا۔ اس چٹاخ نے کھیل کا سارا منظر ہی بدل ڈالا۔ نیل گایوں کے تیز کانوں تک یہ انجانی آواز پہنچی اور وہ کان کھڑے کر کے شک کی نظروں سے اس جھاڑی کی طرف دیکھنے لگیں جہاں سب چھپے بیٹھے تھے۔ بچوں نے بھی اُچھلنا بند کر دیا اور ان کی گردنیں بھی جھاڑی کی طرف مڑ گئیں۔ اب معلوم نہیں انھوں

Visit for more best books www.pdfbooksfree.pk

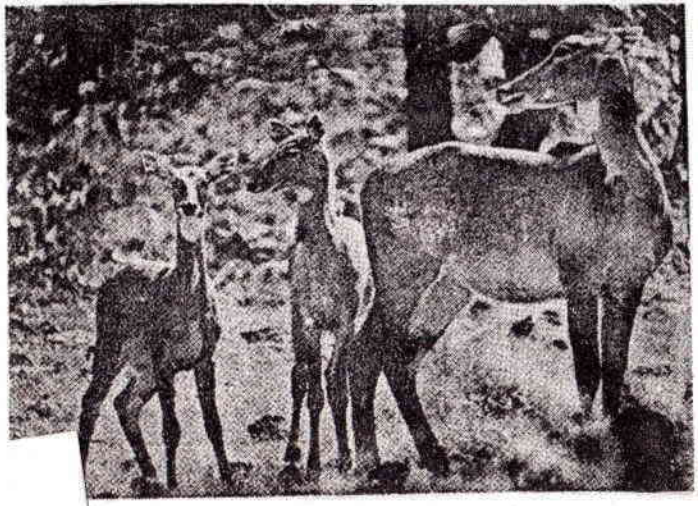

نے کچھ دیکھا یا انھیں انسانوں کی بُو مل گئی، وہ تیزی سے پلٹیں اور ایک کھُلے میدان کی طرف بھاگ کھڑی ہوئیں۔ وہ جب وہاں سے بھاگی ہیں تو سب سے آگے وہی نیل گائے تھی جو پانی پر بھی سب سے پہلے آئی تھی۔ یہ نیل گائے عمر میں دوسروں سے بڑی ـــــ معلوم ہو رہی تھی۔ اس کے پیچھے آٹھ دس گز کا فاصلہ دے کر ایک کے بعد ایک تینوں بچّے اور ان کی مائیں چلیں۔ پھر اتنا ہی فاصلہ رکھ کر نر نیل۔ نر کے چلے جانے کے بعد آخری نیل گائے کچھ دیر اور رُکی، اور جب اس نے دیکھ لیا کہ پورا کنبہ سلامتی کے ساتھ آگے نکل گیا ہے تو اس نے بھی ان کے پیچھے بھاگنا شروع کر دیا۔ نیل گایوں نے فوجیوں کی طرح یہ صف بندی یقیناً اس لیے کی ہوگی کہ خطرے کی صورت میں بچّوں، اور بچّوں والیوں اور کنبے کے سربراہ پر آنچ نہ آئے، اور اگر بُرا وقت آئے بھی تو آگے پیچھے چلنے والی ایک آدھ بوڑھی مادہ تک ہی محدود رہے۔

نر نیل (BLUE BULL) روجھ) بڑا ہی خوبصورت تھا۔ گٹھا ہوا جسم، موٹی گردن، گردن کے اوپری حصّے پر گھوڑے کی طرح آیال، نچلے جبڑے پر داڑھی کی طرح لمبے بالوں کا گچھّا، پیٹ اور ٹانگوں کو چھوڑ کر باقی جسم پر گہرے سیاہ رنگ کے چمکدار بال۔ سر پر تھوڑے خم کھائے ہوئے مضبوط نکیلے سینگ جو آٹھ نو انچ لمبے رہے ہوں گے۔ مادہ نیل گایوں کے سینگ تو نہ تھے مگر نر کی طرح چھوٹی چھوٹی داڑھیاں ضرور تھیں۔ ان کا رنگ بھی نر کی طرح سیاہ نہ تھا، بلکہ ہرن کی طرح گہرا صندلی تھا۔ بچّوں کی رنگت بالکل الگ تھی۔ ان کے بال اپنے بڑوں کے برعکس لمبے لمبے اور بھورے رنگ کے تھے، شکل و صورت، رنگ و روپ اور ـــــ قد میں تینوں بچّے ایک جیسے تھے۔ وہ زیادہ سے زیادہ تین تین مہینے کے رہے ہوں گے۔

سورج غروب ہو رہا تھا اور رات کے سیاہ سائے تیزی سے پھیلتے جا رہے تھے۔ جنگلوں میں تو ویسے بھی گھنے اونچے پیڑوں کی وجہ سے اگر صبح دیر سے ہوتی ہے تو اسی طرح شام بھی ذرا جلدی آ جاتی ہے۔ اس لیے جب یہ دیکھا کہ کوئی دَم میں اتنا اندھیرا ہونے والا ہے کہ پانی بھی دکھائی دینا بند ہو جائے گا تو سب جلدی جلدی

کمین گاہ سے نکلے اور آپس میں باتیں کرتے ہوئے بنگلے کی طرف چل پڑے۔ یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ اس وقت باتوں کا موضوع وہی واقعات و تجربات تھے جو کچھ دیر پہلے آنکھوں کے سامنے گزر چکے تھے۔

وکیل صاحب اور ان کے ساتھی ابھی تک جنگل سے واپس نہیں آئے تھے۔ پریشانی کی بات یہ تھی کہ رات ہو گئی تھی اور اندھیرے میں پیدل چل کر آنا اگر ناممکن نہیں تو آسان بھی نہ تھا، کیوں کہ عام حالات میں تمام جنگلی جانور، وہ چاہے چرند ہوں یا درندے، سبھی انسانوں کا لحاظ کرتے ہیں اور جنگل میں کہیں آمنا سامنا ہو جائے تو راستے سے ہٹ جایا کرتے ہیں۔ لیکن اس طرح کا لحاظ دن کی روشنی میں ہی زیادہ دیکھنے میں آتا ہے۔ اور رات ہو جانے پر اس مروّت میں خاصی کمی آ جاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جنگل کے دن اگر سہانے اور دلفریب ہوتے ہیں تو اس کے برعکس راتیں ڈراونی اور بھیانک ہوتی ہیں۔ اور ایسا تو ہونا بھی چاہیے۔ یہ جنگل کے اصل مالکوں کے نکلنے کا وقت ہوتا ہے۔

اب جنگل کے راجا بھی چہل قدمی کے لیے باہر نکلیں گے اور رات کے پُراسرار اندھیرے میں کبھی ان کی دل دہلانے والی دہاڑ سنائی دے گی تو کبھی کسی کے گھبرا کر بھاگنے کی آواز، کبھی راتوں کو جاگنے والی چڑیاں عجیب عجیب آوازیں نکال کر ڈرائیں گی تو کبھی کسی لکڑبھگے یا کسی لومڑی کی منحوس ہنسی رونگٹے کھڑے کر دینے کے لیے کافی ہوگی۔ کبھی جھینگروں کی سائیں سائیں طبیعت میں ہیجان پیدا کرے گی تو کبھی سارے فضا میں ایسی خاموشی چھا جائے گی کہ دل، حلق میں اٹکتا ہوا معلوم ہو۔ ظاہر ہے کہ ان حالات میں وکیل صاحب کو رات کے وقت جنگل میں بھٹکتے رہنے کے لیے نہیں چھوڑا جا سکتا تھا۔ اس لیے کچھ دیر بعد دو تین لوگوں کے علاوہ، بنگلے کے نئے پرانے سبھی ساتھی جیپ میں سوار ہو کر اس طرف چل پڑے جدھر وکیل صاحب کو جاتے ہوئے دیکھا گیا تھا۔ اس خیال سے کہ کہیں خود بھی نہ بھٹک جائیں، اپنے ساتھ جنگل کے چوکیدار کو بھی لے لیا۔

اب جو چلنا شروع ہوئے تو جنگل کا ایک اور ہی رُوپ سامنے تھا۔ پہلا تاثّر تو یہ تھا کہ جیپ کھلی سڑک پر نہیں، بلکہ کسی سرنگ سے ہو کر گزر رہی ہے جو دائیں بائیں

Visit for more best books www.pdfbooksfree.pk

اور اوپر، تینوں طرف سے بند ہے۔ غالباً یہ احساس پیڑوں اور جیپ کی روشنی نے مل کر پیدا کیا تھا، کیوں کہ اس وقت سڑک کا صرف وہی حصّہ دکھائی دے رہا تھا جو ہیڈ لائٹس کی زد میں آ رہا تھا۔ اس وقت سڑک کا ہر موڑ اور ہر کونا اور اسی طرح وہاں کی ہر ایک جھاڑی اور ہر ایک پیڑ پُراسرار بن کر نئی نئی شکلوں میں سامنے آ رہے تھے کبھی لگتا کہ سڑک کے کنارے ہاتھی کھڑا ہے۔ اور جب قریب پہنچتے تو پتا چلتا کہ جسے ہاتھی کی ٹانگیں سمجھ رہے تھے وہ پیڑوں کے تنے تھے اور لٹکتی ہوئی سوکھی شاخ خواہ مخواہ ہاتھی کی سونڈ بن کر دماغ پر سوار ہو گئی تھی۔ کبھی کوئی جھاڑی ریچھ بن جاتی تو کبھی وہ کسی شیر کا رُوپ دھار لیتی۔

جیپ کو مسلسل نہیں چلایا جا رہا تھا، بلکہ سو پچاس گز چلنے کے بعد اسے روک دیا جاتا اور پھر آوازیں لگا کر خاموشی سے جواب سُننے کی کوشش کی جاتی۔ اور جب کہیں سے کوئی جواب نہ ملتا تو پھر نئی اُمید کے ساتھ آگے بڑھ کر پکارنے کا سلسلہ شروع ہو جاتا۔

جس طرح آبادیوں میں رہنے والوں کو اپنے آس پڑوس اور اپنی سڑکوں گلیوں کے علاوہ یہ بھی معلوم رہتا ہے کہ کہاں کیا ہوتا ہے اور کون سی چیز کہاں مل سکتی ہے، ٹھیک اسی طرح چوکیدار کو بھی اپنے جنگل کے ایک ایک راستے اور ایک ایک جانور کا علم تھا۔ اس کا ثبوت اس طرح ملا کہ ایک بار جب وکیل صاحب کو آوازیں لگا کر آگے بڑھ ہی رہے تھے کہ چوکیدار نے سرگوشی میں کہا۔

"صاحب! اب آواز مت لگائیے۔ اگلے موڑ پر چیتل ملیں گے۔"

اور واقعی ہُوا بھی یہی۔ جیسے ہی جیپ نے اگلا موڑ کاٹا، سامنے چیتل دکھائی دے گئے۔ چیتلوں پر روشنی پڑتے ہی تماشے کی خاطر جیپ روک لی گئی۔ سامنے نر چیتل بھی تھے اور ان کی مادینیں بھی۔ نر نیل کی طرح ان میں بھی صرف نر کے ہی سینگ تھے، جن میں بارہ سنگھے کی طرح کم از کم چھے، اور بعض کے سینگوں میں اس سے بھی زیادہ شاخیں یا نوکیں دکھائی دے رہی تھیں۔ مادینوں کے سینگ نہیں تھے،

لیکن نر اور مادہ دونوں کا رنگ ایک جیسا گہرا صندلی تھا۔ اسی کے ساتھ دونوں کے سفید گل بھی تھے جس سے وہ بہت ہی خوبصورت دکھائی دے رہے تھے۔ چیتل ہکا بکا کھڑے تھے۔ جیپ کی بھرپور روشنی ان پر پڑ رہی تھی جس نے شاید ان کی آنکھیں چُندھیا دی تھیں، اور ان کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کدھر جائیں۔

لیکن اس طرح کھڑے رہنے میں تو خطرہ ہی خطرہ تھا۔ اس لیے انھوں نے وقت کی نزاکت کو سمجھا اور جس طرح کوئی ٹٹول ٹٹول کر چلتا ہے، انھوں نے قدم اٹھائے اور ایک ایک کر کے پیڑوں کی آڑ میں چلے گئے۔

جیپ پھر چلنا شروع ہوئی تو ایک بار پھر چوکیدار نے خبردار کرتے ہوئے کہا کہ تھوڑا آگے چل کر داہنے ہاتھ پر ایک پہاڑ ہے اور اس پہاڑ کے دامن میں گھاس کا ایک چھوٹا میدان۔ وہاں سانبھر دکھائی دیں گے چوکیدار کی بات سن کر سب کو اشتیاق ہُوا کہ دیکھیں اس بار بھی اس کی بات صحیح نکلتی ہے یا نہیں۔ اور سچ مچ کچھ ہی دیر میں میدان بھی آیا اور اس میں سانبھر بھی کھڑے ہوئے ملے چیتلوں کے برعکس سانبھر ذرا فاصلے پر دکھائی دیے تھے۔ چوکیدار کے کہنے پر جب تیز ٹارچ کی روشنی میدان میں ڈالی گئی تو ایسا لگا جیسے چھوٹے چھوٹے کئی بلب ایک ساتھ جل اُٹھے ہیں وہ چھوٹے چھوٹے بلب دراصل ان کی آنکھیں تھیں کیوں کہ جس طرح کسی آئینے پر روشنی ڈالنے سے اس کا عکس اسی آئینے میں نظر آنے لگتا ہے، ٹھیک اسی طرح وہ ٹارچ کی روشنی ہی تھی جو اُن کی آنکھوں سے ٹکرانے پر چھوٹے بلبوں کی طرح دکھائی دے رہی تھی۔

Visit for more best books www.pdfbooksfree.pk

اس طرح سانبھر دکھائے دینے پر سب کو سخت تعجب اور حیرت ہوئی۔ خیال ہوا کہ محض اتفاق سے چوکیدار کی بات صحیح نکل آئی ہوگی ورنہ جنگل کے جانور کوئی کھونٹے سے بندھے ہوتے ہیں کہ جہاں اور جسے بتاؤ، وہی جانور وہاں مل جائے۔ مگر یہ چوکیدار تو کمال کا نکلا۔ وہ نہ صرف اس علاقے کے چپّے چپّے سے واقف تھا، بلکہ

جنگل میں ملنے والے جانوروں کے بارے میں بھی بہت سی باتیں جانتا تھا۔ کہنے لگا:

"سانبھر گھنے جنگلوں اور پہاڑوں میں رہنا پسند کرتا ہے۔ اس کے سینگ چیتل اور بارہ سنگھے کے سینگوں کے مقابلے خوب موٹے موٹے اور بھاری ہوتے ہیں۔ چیتل کی طرح اس میں بھی صرف نر کے سینگ ہوتے ہیں، مادہ کے نہیں۔ سانبھر کے سینگوں میں بھی کم از کم چھے اور بعض بعض کے اس سے بھی زیادہ شاخیں ہوتی ہیں۔ نر کی گردن بھاری اور اس پر لمبے لمبے سخت اور چھدرے بال ہوتے ہیں۔ چاروں پیر گٹھے ہوئے، مضبوط اور متناسب۔ پہاڑوں پر سانبھر اتنی تیزی سے چڑھتا ہے کہ چیتل یا ہرن تو اس کی گرد بھی نہیں پا سکتے۔"

چوکیدار نے اس طرح کئی بار پہلے سے بتا کر کبھی چیتل دکھائے تو کبھی سانبھر، اور یہ بات صرف سیّد کے لیے ہی نہیں، ان کے بڑے ساتھیوں کے لیے بھی ایک نئی اور حیرت انگیز بات تھی۔ اس طرح اچانک آمنا سامنا ہو جانے یا دکھائی دے جانے پر جانور حیرت سے روشنی کی طرف دیکھنا شروع کر دیتے۔ اگر اس وقت

روشنی ڈالنے والے ہلے جُلے بغیر اپنی جگہ خاموش بیٹھے رہتے تو وہ بھی کچھ دیر ساکت کھڑے رہتے اور ایسے لگتے جیسے زندہ جانور نہیں، اسٹف کیے یا بنائے ہوئے جانور ہیں۔ اس وقت نہ وہ اپنے کان ہلاتے اور نہ ہی اپنی دُموں کو حرکت دیتے۔ لیکن وہ زیادہ دیر صبر نہ کر پاتے اور احتیاط کی عادت انھیں وہاں سے بھاگ جانے پر مجبور کر دیتی۔

کافی دیر سے ایسی آوازیں آ رہی تھیں جیسے کہیں کوئی کُتّا بھونک رہا ہے۔ یہ آوازیں کبھی قریب سے آتی ہوئی معلوم ہوتیں اور کبھی دور سے۔ جیپ جب اس جگہ سے آگے بڑھی جہاں سانبھر دکھائی دیے تھے تو آوازوں سے کچھ ایسا اندازہ ہوا کہ بھونکنے والا اس جگہ سے زیادہ دور نہیں ہے۔ وکیل صاحب کی تلاش میں جیپ کو ایسی پتلی پتلی سڑکوں پر بھی لے جانا پڑ رہا تھا جو جنگل میں بہت اندر کی طرف تھیں۔ ایسی ہی ایک چھوٹی سڑک پر جب جیپ مُڑی تو دیکھا کہ سڑک کے بیچوں بیچ دو جانور کھڑے ہیں۔ روشنی پڑتے ہی ان کی آنکھیں چمک اٹھیں۔ لیکن ان کی چمک چیتل یا سانبھر کی آنکھوں کی طرح ہلکی سبزی مائل نہ تھی، بلکہ انگاروں کی طرح لال رنگ لیے ہوئے تھی۔ سیّد کافی دیر سے بھوں بھوں کی آوازیں سنتے آ رہے تھے۔ آنکھیں چمکتے ہی ان کے منہ سے نکلا "___ کتّے ___"

"مگر چوکیدار نے کچھ اور ہی بتا کر سب کو حیرت اور گھبراہٹ میں ڈال دیا۔ اس نے آہستہ سے کچھ بتانے کے بجائے جلدی سے کہا "___ صاحب، گاڑی روکیے ___ سامنے شیر کھڑے ہیں ___ کانکڑ انھیں ہی دیکھ کر بھونک رہا تھا ___"

ایک لمحہ ضائع کیے بغیر جیپ کو واپس موڑا گیا۔ یہاں یہ بتانے کی ضرورت نہیں کہ اگر جیپ چلانے والے کو راستہ دیکھنے کی مجبوری نہ ہوتی تو میدان چھوڑتے وقت دوسروں کے ساتھ اس کی آنکھیں بھی یہی دیکھنے میں لگی ہوتیں کہ راجا صاحب پیچھا تو نہیں کر رہے۔ اس طرح سوچنا مناسب بھی تھا کیوں کہ راجا کہیں کا بھی ہو، اس کا احترام کرنا ہی پڑتا ہے۔ اور یہاں تو سابقہ

Visit for more best books www.pdfbooksfree.pk

پڑنے والا تھا جنگل کے راجا سے جن کے بارے میں یقین سے بتایا ہی نہیں جا سکتا تھا کہ سرکار اچھے موڈ میں ہیں یا بُرے۔ ہو سکتا تھا کہ اس وقت ان کا پیٹ بھرا ہو، اور وہ یہ سوچ کر ایک کنارے ہو جائیں لہ۔ جانے دو بچاروں کو۔ کسی کو بے وجہ پریشان کرنا راجاؤں کی شان کے خلاف ہے۔ اور اگر اتفاق سے موڈ خراب ہو تو غصّے میں وہ جو بھی کر گزریں، کم ہے۔ اور صاحب موڈ تو آخر موڈ ہے، اور خاص طور سے بادشاہوں کا موڈ۔ گھڑی میں تولہ گھڑی میں ماشہ۔ کون جانے کب اور کس بات پر خراب ہو جائے اس لیے بادشاہ سلامت کے سامنے نہ پڑنا ہی اچھا۔

کانکڑ اب بھی جھاڑیوں کے پیچھے بھونک بھونک کر دوسرے جانوروں کو خطرے سے آگاہ کر رہا تھا۔ دراصل مور کی طرح کانکڑ کی بھی یہ خصلت ہے کہ جب کسی ایسے جانور کو جنگل میں گھومتے پھرتے دیکھتا ہے جس سے دوسروں کی جان کو خطرہ ہو تو وہ بولنا شروع کر دیتا ہے کہ ہٹو بچو، سامنے خطرہ ہے۔ لیکن بھونکنے کی بات سے یہ نہ سمجھ لیا جائے کہ کانکڑ، کتّے کی نسل کا کوئی جانور ہو گا۔ جی نہیں، کانکڑ گھاس پات کھانے والا ایک قسم کا ہرن ہے، اصل نسل ہرن۔ اگر بچارے کی آواز کتّے جیسی ہے تو اس میں کانکڑ (BARKING DEER) کا کیا قصور۔ کانکڑ ہرن ذات کے دوسرے جانوروں چیتل، سانبھر اور پاڑے کی طرح سبزی خور، ہرن کی طرح ٹانگیں، ہرن کی طرح پھٹے ہوئے کھُر، ہرن کی طرح سر پر سینگ۔ ایک دو نہیں، چار چار۔ ایک ہی جڑ سے دو دو شاخیں نکلی ہوئی۔ لیکن یہ سینگ ہرن، چیتل، یا سانبھر کی طرح ٹھوس اور چکنے نہیں، بلکہ زراف کی طرح روئیں دار کھونٹیوں جیسے۔ نر کے قد کا اوسط دو فٹ اور وزن بیس بائیس کلو۔ مادہ قد میں تین چار انچ چھوٹی تو وزن بھی نر کے مقابلے پانچ سات کلو کم۔

جیپ ذرا سی دیر میں اس جگہ سے کافی دور نکل آئی جہاں شیر دکھائی دیے تھے۔ اب کانکڑ کی آوازیں سنائی دینا بند ہو گئی تھیں۔ وکیل صاحب کو بھی پہلے کی طرح رُک رُک کر پکارنے کا سلسلہ پھر شروع کیا جا چکا تھا۔ لیکن شیروں سے ملاقات

کے بعد ان کی طرف سے فکر اور پریشانی بہت بڑھ گئی تھی۔ سب کے دماغوں میں کچھ ایسے اندیشے اُبھر ناشروع ہو گئے تھے جن کو منہ پر لاتے ہوئے اچھا نہیں لگ رہا تھا۔ احتیاطاً اب آوازیں لگانے کے ساتھ ساتھ ہوا میں بندوق کے فائر بھی کیے جانے لگے کہ کسی بھی طرح سہی، وکیل صاحب کے کانوں تک ڈھونڈنے والوں کی آواز تو پہنچے۔ اس طرح شاید دوسرا یا تیسرا فائر ہی کیا ہو گا کہ ایک بار واضح طور سے کچھ ایسی آواز سنائی دی جیسے کہیں دور، کوئی پکار رہا ہے۔ فوراً ہی جیپ کے پہیے آواز کی سمت موڑ دیے گئے۔ جلدی جلدی آوازوں کے تبادلے ہوئے اور آخر جیپ اس جگہ پہنچ ہی گئی جہاں کوئی پکار پکار کر کہہ رہا تھا، "_____ میں یہاں ہوں _____ یہاں _____ پیڑ کے اوپر _____"

یہ بتانے کی ضرورت نہیں کہ یہ وکیل صاحب ہی تھے جو اپنے ساتھی کے ساتھ گولر کے ایک پیڑ پر چڑھے ہوئے آوازیں لگا لگا کر ڈھونڈنے والوں کو اپنے پاس بُلا رہے تھے۔ دونوں پیڑ سے اُتارے گئے۔ دیکھا تو حال بے حال تھا۔ کپڑے تار تار۔ ہاتھ پیر اور چہروں پر خراشیں۔ مُنھ کے پیا سے۔ چہروں پر ہوائیاں اڑی ہوئی۔

جب بنگلے کی طرف واپسی ہونے لگی تو اٹک اٹک کر انھوں نے اپنی بیتی سنانی شروع کر دی۔ کہنے لگے، "ہم بنگلے سے زیادہ سے زیادہ تین چار فرلانگ ہی آگے گئے ہوں گے کہ قریب کی جھاڑی سے جنگلی مرغ کی بانگ سنائی دی۔ میں جلدی سے آڑ میں ہو گیا۔ سوچ رہا تھا کہ جب جھاڑی سے باہر نکلے گا تو مار لوں گا۔ لیکن وہ مرغ کچھ زیادہ ہی سیانا نکلا۔ تھوڑے تھوڑے وقفے سے وہ اسی طرح اذانیں دیتا رہا اور باہر نہ آیا آخر تنگ آ کر میں نے اپنے ساتھی سے کہا کہ مرغ کو باہر نکالنے کے لیے جھاڑی پر پتھر مارے۔ خیال تھا کہ پھر چاہے بھاگے یا آڑے، اس پر فائر کرنے کا موقع مل ہی جائے گا۔ اتفاق کی بات کہ جہاں بیٹھے ہوئے تھے، وہاں قریب میں ایسے چھوٹے پتھر نہ تھے جنھیں اٹھا کر پھینکا جا سکتا۔ ناچار دونوں اپنی جگہ سے اٹھے اور جھاڑی کی

Visit for more best books www.pdfbooksfree.pk

طرف بڑھنے لگے۔ وہاں ہر طرف پیڑوں کے نیچے سوکھے پتّے بکھرے پڑے تھے۔ ان پر پیر پڑے تو چُرمُر کی تیز آوازیں پیدا ہونے لگیں۔ ان آوازوں کو سُن کر نہ صرف مرغ نے بولنا بند کر دیا، بلکہ تیتر کی طرح دبے پاؤں ایک جھاڑی سے دوسری میں اور دوسری سے تیسری میں چھُپتا چھُپاتا وہاں سے نکل بھاگا۔ اور جب وہاں سے کافی دور نکل گیا تو شاید چڑانے کے لیے پھر اذانیں دینے لگا۔ میں نے بھی اس کا پیچھا نہ چھوڑا اور اسی جگہ جا پہنچا جہاں دوسری بار اس کی آواز سنائی دی تھی۔ لیکن اس بار بھی احتیاط کے باوجود پتّوں پر چلنے کی آوازیں ہوئیں اور وہ آگے بڑھ گیا۔ ایک موقع پر تو چیتل بھی دکھائی دیے۔ لیکن تھے رینج سے باہر، یعنی اتنی دُور کہ فائر کام نہ کرتا۔ پیڑوں کی آڑ لے کر ان کی طرف بڑھنا شروع کیا۔ یہ سوچتے ہوئے کہ پتّوں پر پیر نہ پڑے چلتے ہوئے زمین کی طرف ہی نگاہیں رکھیں۔ اس طرح کوئی آٹھ دس میٹر آگے بڑھ گئے۔ لیکن اب جو سامنے نظر ڈالتے ہیں تو چیتل غائب۔ اتنی احتیاط کے باوجود چیتلوں نے ہمیں دیکھ لیا تھا، اور جب ہم نظریں نیچی کیے کیے آگے بڑھ رہے تھے تو اس دوران انھیں فرار ہونے کا موقع مل چکا تھا ——

"اب یہ بات سمجھ میں آچکی تھی کہ جنگل میں پیدل چل کر شکار کھیلنے میں کامیابی کی اُمید بہت کم ہے۔ اس لیے یہی فیصلہ ہوا کہ کہیں پانی کے قریب بیٹھ کر قسمت آزمائی

کی جائے۔ پانی کے پاس بیٹھنے کا خیال اس لیے بھی آیا کہ اس وقت پیاس بھی لگ رہی تھی۔ پانی وہاں سے کافی دور نکلا۔ پہنچتے پہنچتے بیس پچیس منٹ لگ گئے۔ راستے میں کوئی شکار بھی دکھائی نہ دیا، ورنہ ممکن تھا کہ اس کے چکّر میں اور دیر ہو جاتی۔

"جب تک پیڑوں کے نیچے رہے، ایسا لگتا رہا کہ دن چھپنے لگا ہے۔ مگر اب جو پانی کے پاس کھلی جگہ پر آئے تو اندازہ ہوا کہ —— سورج غروب ہونے میں ابھی بہت دیر ہے۔ وقت کو غنیمت جانتے ہوئے اس سے فائدہ اٹھانے کی فکر ہونے لگی۔ خوش قسمتی سے قریب ہی ایک ایسی جگہ مل گئی جہاں چھپ کر پانی پر آنے والے جانوروں پر نظر رکھی جا سکتی تھی۔ موسم دن کے مقابلے کافی خوشگوار ہو چکا تھا شکار نہ ملنے کا طبیعت پر جو بوجھ تھا، وہ اس جگہ کے پُرسکون اور دل فریب ماحول نے نہ صرف مٹا دیا، بلکہ بجائے ملال کے دل میں تازگی و خوشی کا احساس موجیں لینے لگا خوشی و انبساط کی یہ کیفیت کتنی دیر رہی، اس کے بارے میں، میں کوئی اندازہ نہیں لگا سکتا۔ بس اتنا جانتا ہوں کہ ہوش تب آیا جب کانوں میں ایک نئی اور نامانوس آواز پڑی۔ کوئی جانور ٹھہر ٹھہر کر چلتا ہوا ہماری طرف آرہا تھا۔ لیکن مشکل یہ آن پڑی کہ وہ سامنے سے آنے کے بجائے اس پہاڑی سے اُترتا ہوا معلوم ہو رہا تھا جو ہماری پُشت پر تھی، اور درمیان میں ایک جھاڑی ہونے کی وجہ سے ہم یہ نہیں دیکھ سکتے تھے کہ وہ کیا ہے۔ دل میں سوچنے لگا کہ اگر کانکڑ یا چیتل ہوا تو منہ آجائے گا۔ اس وقت اپنی جگہ سے اُٹھنا مناسب نہ تھا۔ مجبوراً دھڑکتے دل کے ساتھ چُپ چاپ بیٹھا انتظار کرتا رہا کہ کہیں سے اس کی جھلک نظر آئے تو اگلا قدم اٹھاؤں ——

"اس جانور نے پہاڑی سے نیچے اترنے میں بڑی دیر لگائی۔ آواز کی طرف کان لگانے سے ایسا محسوس ہوا کہ وہ راستے میں پڑنے والی جھاڑیوں سے کچھ توڑ توڑ کر کھاتا ہوا چل رہا ہے۔ فوراً خیال آیا کہ ہرن کی نسل کا کوئی جانور ہوگا۔ لیکن کچھ دیر بعد ایسا لگا کہ پنجوں سے زمین کھرچنے کی کوششیں بھی ہو رہی ہیں تو طبیعت گھبرائی کہ کہیں کوئی درندہ تو ادھر نہیں آگیا۔ بھاگنے کا موقع نہ تھا۔ اس لیے آوازوں کی بنیاد پر یہ

Visit for more best books www.pdfbooksfree.pk

سمجھنے کی کوشش کرنے لگا کہ وہ کیا ہو سکتا ہے ___ چیتل ___ سانبھر ___ یا کوئی اور ___؟ میں ابھی خیالی گھوڑے دوڑا رہا تھا کہ اتنے میں کوئی بیس پچیس گز کی دوری پر اس نے خود ہی اپنی جھلک دکھا دی۔

"آپ سمجھ رہے ہیں وہ کیا تھا؟ وہ ریچھ تھا، لمبے لمبے کالے بالوں والا ایک بھاری بھرکم ریچھ جو بیر اور پودوں کی جڑیں کھاتا ہوا پانی کی طرف بڑھ رہا تھا۔ اس وقت ہم اس طرح چھپے ہوئے تھے کہ ریچھ کو ہماری موجودگی کا پتا نہ چل سکا۔ ریچھوں کے بارے میں ہمیں پہلے سے معلوم تھا کہ انھیں بہت جلدی غصّہ آجاتا ہے۔ ذرا سی بات بُری لگی اور مرنے مارنے پر تُل گئے۔ اس لیے یہی مناسب ہوا کہ کچھ دیر اس کا تماشا دیکھ لیا جائے اور جب یہ پانی پی کر چلا جائے تب ہم بھی اپنی راہ لیں ___

"ریچھ کے راستے میں اب جھڑ بیریوں کے پیڑ نہ تھے۔ اس کا رُخ پانی کی طرف تھا جہاں دور دور تک چھوٹے بڑے پتھر بکھرے پڑے تھے۔ یہ وہ پتھر تھے جو برسات میں پانی کے تیز بہاؤ کے ساتھ پہاڑوں سے ٹوٹ ٹوٹ کر آئے تھے اور ایک دوسرے سے ٹکرا ٹکرا کر چھوٹے اور چکنے ہو گئے تھے۔ ریچھ چلتے چلتے ایک جگہ پھر رُکا اور پتھروں کے ایک ڈھیر پر جھک کر غور سے کچھ دیکھنے لگا۔ اسے وہاں یا تو پانی نظر آگیا تھا یا کھانے کی کوئی چیز جیسے شہد کی مکھیوں کا کوئی چھتّا۔ یا یہ بھی ہو سکتا ہے کہ محض تجسّس کی خاطر اس جگہ کا معائنہ کیا جا رہا ہو، کیوں کہ دو ایک بار اُس نے پتھروں کو اِدھر اُدھر کھسکایا بھی اور اندر منہ ڈال کر کچھ دیکھا بھی، مگر شاید اسے وہاں اپنے مطلب کی کوئی چیز نہ ملی اور وہ بغیر منہ چلائے اُس طرف بڑھ گیا جہاں ڈھلتے ہوئے دن کی

روشنی نے پانی کو اور زیادہ چمکدار بنا دیا تھا۔

"میری ناک میں بہت دیر سے سُرسراہٹ ہو رہی تھی۔ ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ چھینک آنے والی ہے۔ مگر ریچھ کے ڈر سے میں کوشش کر کے اسے روکتا رہا تھا۔ لیکن ہونی تو ہو کر رہتی ہے۔ میری کوشش کامیاب نہ رہی اور ٹھیک اس وقت جب ریچھ گڑھے کے پاس جا کر پانی کو منہ لگانے ہی والا تھا کہ ___ آچ ___ چھیں ___ کا زبردست گولا چل پڑا اس چھینک نے ریچھ کو گڑبڑا دیا۔ وہ تیزی سے پانی کے پاس سے ہٹا اور اپنے پچھلے پیروں پر کھڑے ہو کر اس طرف دیکھنے لگا جہاں ہم چھپے بیٹھے تھے۔ اگر فاصلہ زیادہ رہا ہوتا تو ریچھ اپنی چندھی آنکھوں سے شاید ہمیں نہ دیکھ پاتا۔ لیکن اس وقت ہم اس سے زیادہ دور نہ تھے۔ اس کی نگاہوں نے ہمیں تاڑ لیا۔ دیکھتے ہی دیکھتے وہ غصّے کی آوازیں نکالتا ہوا ہماری طرف دوڑ پڑا۔ مجھے حالات کے اس طرح اچانک بدل جانے کی امید نہ تھی۔ پھر بھی جس تیزی سے ریچھ نے حملے کا فیصلہ کیا تھا، اسی تیزی سے میں بھی بچاؤ کی تدبیر سوچ چکا تھا۔ اس ریچھ کو مارنے کا پہلے بھی میرا ارادہ نہ تھا اور نہ اس وقت جبکہ وہ ہم پر حملہ کر چکا تھا، میں اُسے ٹھکانے لگانے کے حق میں تھا۔ میں نے سوچا کہ جان سے مارنے کی بجائے اُسے ڈرا کر بھگا دینا زیادہ اچھا رہے گا۔ اس لیے جب دیکھا کہ وہ بھڑبھڑ کرتا سر پر ہی چلا آرہا ہے تو میں نے اسے بچاتے ہوئے زمین کی طرف ایک فائر کر دیا۔ امید کے مطابق دھماکے کے ساتھ ریچھ کا آگے بڑھنا رُک گیا۔ مگر اسی کے ساتھ ایک عجیب بات یہ ہوئی کہ اس نے انسانوں کی طرح رونا چلّانا شروع کر دیا۔ یہ آوازیں بالکل ایسی تھیں جیسے کوئی عورت یا بچّہ شدید چوٹ لگ جانے

Visit for more best books www.pdfbooksfree.pk

کی وجہ سے ایک دم رو پڑے۔ شاید بندوق کی گولی کسی پتھر سے ٹکرا کر اس کے اگلے بازو میں اچٹتی ہوئی جا لگی تھی اور وہ تکلیف کی وجہ سے چیخنے چلانے پر مجبور ہو گیا تھا ——

"ریچھ کو اس طرح روتے چلاتے مشکل سے ایک آدھ منٹ ہی گزرا ہو گا کہ اس کی آواز پر ایک اور ریچھ بھی وہاں آ گیا۔ دوسرے ریچھ کے بھاگ کر وہاں آنے اور بار بار پچھلے پیروں پر کھڑے ہو کر ادھر ادھر دیکھنے سے صاف معلوم ہو رہا تھا کہ وہ معاملے کی تہہ تک پہنچ چکا ہے اور اسے دشمن کی تلاش ہے۔

"اب جو یہ نئی صورت دیکھی تو ضبط کا یارا نہ رہا اور بے اختیار ہم دونوں وہاں سے بھاگ کھڑے ہوئے۔ آنے والا دوسرا ریچھ اس وقت تک اتنا قریب نہ آیا تھا کہ ہمیں دیکھ لیتا۔ لیکن جیسے ہی ہم وہاں سے بھاگے، اس نے ہمیں دیکھ لیا اور وہ بھی پہلے والے کی طرح غصے میں بھوں بھوں کرتا ہوا ہمارے پیچھے دوڑ پڑا۔ اب ہم آگے آگے اور غضبناک ریچھ پیچھے پیچھے۔ بھاگتے بھاگتے محسوس ہوا کہ ریچھ آہستہ آہستہ قریب سے قریب ہوتا جا رہا ہے۔ اور اگر بھاگنے کی یہی رفتار رہی تو کچھ ہی دیر میں ہم تک پہنچ جائے گا ——

"آپ کہتے ہوں گے کہ اپنے بچاؤ میں ریچھ کو مارا کیوں نہیں۔ آپ کا کہنا درست، لیکن اس وقت کچھ ایسی صورت آ پڑی تھی کہ میں فائر نہیں کر سکتا تھا۔ ہوا یہ تھا کہ جب ہم پانی کے پاس جا کر بیٹھے تھے تو میں نے کارتوسوں کا تھیلا کندھے سے اتار کر پاس رکھ لیا تھا۔ جب گھبراہٹ میں وہاں سے بھاگنا پڑا تو اسے اٹھانا بھول گیا۔ میرے پاس اس وقت دو نالی بندوق تھی۔ ایک کارتوس میں پہلے چلا چکا تھا، اور بچے ہوئے دوسرے کارتوس کو میں تب چلانا چاہتا تھا جب بالکل ہی جان پر بن جاتی اور اس کو چلائے بغیر چارہ نہ رہتا ——

"اب تک ہم تینوں کھلی سڑک پر لگے آگے پیچھے بھاگ رہے تھے۔ بھاگتے بھاگتے میں نے سوچا کہ اگر آگے ندی آ گئی تو کھلی جگہ میں ریچھ سے جان بچانا مشکل ہو جائے

جائے گی۔ یہ بات ذہن میں آتے ہی میں اپنے ساتھی کو لے کر جھاڑیوں میں گھس گیا۔ اتفاق کی بات، وہاں جھاڑیاں بہت قریب قریب اُگی ہوئی تھیں۔ لیکن تھیں کانٹوں والی۔ جان بچانے کے لیے ہم تکلیف کی پروا کیے بغیر اندر ہی اندر بھاگتے چلے گئے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ کانٹوں سے کپڑے پھٹ گئے اور ہاتھ پیروں، بلکہ چہرے پر بھی گہری گہری خراشیں پڑ گئیں۔ لیکن فائدہ یہ ہوا کہ ریچھ سے پیچھا چھوٹ گیا۔ کچھ دیر انتظار کے بعد جب پوری طرح اطمینان ہو گیا کہ ریچھ وہاں تک نہیں آیا ہے تو راستہ کاٹ کر پھر سڑک پر آ گئے۔ لیکن اس ہنگامے میں رات سر پر آ چکی تھی اور واپسی کا راستہ اسی طرف جاتا تھا جدھر ریچھوں کے ملنے کا ڈر تھا۔ ویسے بھی ایک کارتوس کے ساتھ رات کے وقت جنگل میں خطرے کی جگہ سے گزرنا عقل کی بات نہیں تھی۔ آخر دونوں کی یہی رائے ہوئی کہ پیڑ پر چڑھ کر رات گزاری جائے۔ اگر قسمت سے راستے میں کوئی بچاؤ پارٹی آ گئی تو ٹھیک ورنہ دن نکلنے پر اتر کر خود ہی بنگلے پر پہنچ جائیں گے ——"

وکیل صاحب اپنی کہانی پوری کر چکے تھے اور اتنی دیر میں جیپ بھی جنگل کے چکر لگا کر بنگلے کے قریب پہنچ چکی تھی۔ اتفاق سے جیپ کو اس راستے سے بھی گزرنا پڑا جہاں شیر نے بھینس کو زخمی کیا تھا۔ اس وقت ایک جھونپڑی سے کچھ عورتوں کے رونے کی آوازیں سنائی دیں۔ ان کے بین کرنے سے اندازہ ہوا کہ بھینس زخموں کی تاب نہ لا کر مر چکی ہے۔ اتنی رات گئے ان غم زدوں سے ہمدردی ظاہر کرنے کا موقع نہ تھا۔ اس لیے دل ہی دل میں افسوس کرتے ہوئے آگے بڑھ گئے۔

اس وقت پوری فضا میں جھینگروں کی تیز آوازیں گونج رہی تھیں لیکن آوازوں کی یہ گونج ایسی نہ تھی جو کانوں کو ناگوار گزرتی، بلکہ ایسے مسحور راگ کی طرح تھی جو سننے والے پر غنودگی طاری کر دیتا ہے۔ یہ مئی کا مہینا تھا، جبکہ شمالی ہند میں سخت گرمی شروع ہو جاتی ہے۔ اس کے باوجود وہاں رات میں اتنی ٹھنڈ ہو چکی تھی کہ گرم کپڑوں کی ضرورت پڑ گئی تھی۔ مشکل یہ تھی کہ اتنی سردی کے باوجود دروازے بند کر کے بنگلے کے اندر نہیں لیٹا جا سکتا تھا۔ چھت میں بچھو بھی رہتے تھے جو اوپر سے گر کر ڈنک مار سکتے تھے۔

Visit for more best books www.pdfbooksfree.pk

مجبوراً سونے کے لیے بنگلے کے کھُلے صحن میں ہی انتظام کرنا پڑا۔ یعنی ایسے صحن میں جہاں چہار دیواری نہ تھی، اور کوئی بھی جانور، بلا روک ٹوک جب چاہتا وہاں آسکتا تھا۔

اس وقت تک اتنی رات بیت چکی تھی کہ اس کا دوسرا پہر بھی ختم ہو رہا تھا۔ کچھ دیر بعد لیٹنے کو سب اپنے اپنے بستروں پر لیٹ گئے، لیکن جگہ اور ماحول کی تبدیلی نیند کے آنے میں رکاوٹ بنی رہی۔ نیند کے نہ آنے کی ایک وجہ اور بھی تھی۔ دراصل جنگل کے اس مختصر قیام میں اتنے زیادہ منظر نگاہوں کے سامنے آچکے تھے جن کا شہروں میں رہ کر ٹھیک طرح تصور بھی نہیں کیا جاسکتا تھا۔ اس وقت سبھی کے دماغوں میں یہی مناظر گھوم رہے تھے جو ہنگامہ خیز بھی رہے تھے اور دل فریب بھی۔

نیند نہ آئی تو پھر باتوں کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ پہل سیّد نے کی۔ کہنے لگے،

"بچھّو تو ٹپکا ہو گئے ——"

"کیا مطلب ——؟" چچا جان نے پوچھا۔

"ایک بار آپ ہی نے تو وہ کہانی سنائی تھی کہ ایک آدمی بڑا نکمّا اور کام چور تھا۔ بیوی کے روز روز کے طعنوں سے تنگ آکر آخر ایک دن کام کی تلاش میں نکلا۔ راستے میں رات ہو گئی اور کالے کالے بادل بھی گھِر آئے۔ ایک جگہ اسے ایک جھونپڑی دکھائی دی۔ وہاں ایک بڑھیا رہتی تھی۔ بڑھیا سے اجازت لے کر وہ جھونپڑی میں ٹھہر گیا۔ سونے سے پہلے اس نے بڑھیا سے پوچھا کہ یہاں شیر ویر تو نہیں آتا، میں نے اپنا گدھا باہر کھڑا کر دیا ہے۔ بڑھیا نے کہا —— یہاں شیر کا تو نہیں، ٹپکے کا ڈر ہے —— اتفاق سے شیر یہ باتیں سُن رہا تھا۔ اس نے دل میں سوچا کہ 'ٹپکا'، مجھ سے بھی طاقتور کوئی جانور ہو گا، جبھی تو بڑھیا مجھ سے نہیں، ٹپکے سے ڈر رہی ہے ——"

سیّد کے منہ سے یہ ادھوری کہانی سن کر سب ہنس پڑے۔ مبین چچا بولے،

"بات تو سیّد صاحب ٹھیک ہی کہہ رہے ہیں۔ یہاں بھی شیر کا نہیں، بچھوؤں کے

ٹپکے کا ڈر زیادہ ہے تبھی تو کوئی اندر لیٹنے کو تیار نہیں ہوا۔ ویسے بھی سچ تو یہ ہے کہ کھُلے دشمن کے مقابلے چھُپا ہوا دشمن زیادہ خطرناک ہوتا ہے۔ بچھّو اس وقت ہمارے لیے چھپے ہوئے دشمن کی طرح ہے جس کے بارے میں کچھ نہیں کہا جا سکتا کہ کس کے، کب اور کہاں ڈنک مار دے۔ لیکن سب بچھو ایک جیسے زہریلے نہیں ہوتے اس وقت دنیا میں اُن کی تقریباً چھ سو قسمیں ملتی ہیں۔ سانپ کی طرح ان میں بھی کچھ میں زہر نہیں ہوتا۔ اسی طرح بعض کم اور بعض بہت زیادہ زہریلے ہوتے ہیں دراصل زہر کا تعلق ان کی نسل اور ان کے سائز سے بھی ہے

مثلاً بچھوؤں کی زیادہ قسمیں ایسی ہیں جنھیں خطرناک نہیں مانا جاتا۔ ان کے ڈنک سے تکلیف تو ہو سکتی ہے، لیکن جان جانے کا خطرہ نہیں ہوتا۔ البتہ بعض گرم ملکوں کے بچھّو، جیسے مصر کے بچھّو یا افریقہ کے دوسرے ملکوں اور عرب ممالک کے بچھّو بڑے خطرناک ہوتے ہیں۔ بچوّں اور بوڑھوں پر ان کا زہر، سانپ کے

زہر کی طرح فوراً اثر کرتا ہے اور اگر فوری طور پر علاج نہ کیا جائے تو مریض کی موت تک واقع ہو جاتی ہے۔

Visit for more best books www.pdfbooksfree.pk

"بچھوؤں کے دانت نہیں ہوتے۔ مکڑیوں کی طرح وہ بھی اپنے شکار کا خون چوس کر پیٹ بھرتے ہیں۔ جھینگر، ٹڈیاں، کاکروچ، مکڑیاں اور اس جیسے دوسرے کیڑے ان کا من پسند کھاجا ہیں۔ لیکن ہوتے ہیں ذرا شرمیلے چہل قدمی اور شکار کے لیے عموماً رات میں ہی نکلتے ہیں اور دن کے وقت مٹی اور پتھروں کے نیچے، دَرزوں اور سوراخوں، اور اسی طرح کی دوسری جگہوں میں چھپے رہتے ہیں۔ رات میں بھی جہاں کوئی کھٹکا ہوا اور انھوں نے آڑ پکڑی یہی وجہ ہے کہ رات کے وقت جوتوں میں بھی چھپ جاتے ہیں اور بے خیالی میں کوئی انھیں پہن لے تو ڈنک مار دیتے ہیں۔ ——"

مبین چچا نے جوتوں میں بچھوؤں کے چھپنے کی بات کیا بتائی کہ سعید کے ہاتھ فوراً چارپائی کے نیچے رکھے اپنے جوتوں کی طرف بڑھ گئے اور لگے ٹھونک ٹھونک کر جھاڑنے کہ کہیں کوئی بچھو تو ان میں نہیں بیٹھ گیا۔

انوار چچا بتانے لگے —— بچھو کا زہر اس کی دُم کے آخر میں ایک تھیلی کی شکل میں ہوتا ہے۔ اس تھیلی کے سر پر ایک ڈھال دار نوک ہوتی ہے۔ یہی اس کا ڈنک ہے۔ یہ ڈنک دشمن کو نقصان پہنچانے کے لیے بھی استعمال ہوتا ہے اور اپنے شکار پر قابو پانے میں بھی کام آتا ہے۔ ڈنک مارنے کو محاورے کی زبان میں بچھو کا کاٹنا بھی کہا جاتا ہے۔ بچھو کے کاٹنے سے اگر جان کو خطرہ نہ ہو تب بھی تکلیف بہت ہوتی ہے۔ تبھی تو یہ کہاوت مشہور ہے کہ سانپ کا کاٹا سوئے اور بچھو کا کاٹا روئے۔ نسلوں اور علاقوں کے اعتبار سے یہ الگ الگ رنگوں کے ہوتے ہیں۔ قد بھی ایک جیسا نہیں ہوتا۔ بڑے سے بڑا بچھو، دُم کی نوک سے منہ تک زیادہ سے زیادہ ۱۸ سنٹی میٹر۔ یعنی سات انچ لمبا ہوتا ہے۔ بچھو کے اگلے حصّے میں زنبور کی طرح جو دو منہ دکھائی دیتے ہیں اور جن سے شکار وغیرہ پکڑنے میں مدد لی جاتی ہے، وہ اصل میں اس کے بازو ہیں۔ منہ انھی بازوؤں کی جڑ میں ہوتا ہے۔ بچھوؤں کی ایک خاص بات یہ بھی ہے کہ یہ خشکی کے قدیم ترین

جانوروں میں سے ہیں۔ ان کی تاریخ لاکھ دو لاکھ نہیں، چالیس کروڑ سال پرانی ہے اور یہ منطقۂ حارّہ کے تمام گرم ملکوں، یہاں تک کہ جنوبی یورپ اور کناڈا کے مغربی ساحلی علاقہ میں بھی پائے جاتے ہیں ——"

آدھی رات بیت چکی تھی، اور باتیں تھیں کہ ختم ہی نہ ہو رہی تھیں۔ ایک کہانی پوری نہ ہو پاتی کہ بات میں سے بات نکل کر دوسری شروع ہو جاتی۔ شیر اور ٹیکے کی بات تو ذہنوں میں تازہ ہی تھی، اس لیے اب شیروں کے قصّے شروع ہو گئے، اور پھر قصوں سے لطیفوں پر اتر آئے۔ عالم چچا ٹھہرے حساب کے آدمی اس لیے ان کا لطیفہ بھی ایک بٹا دو کا رہا۔ اپنے اوپر ڈھال کر کہنے لگے کہ ایک بار میں جنگل میں جا رہا تھا۔ اکیلا۔ سامنے سے دو شیر آ گئے۔ پھاڑ کھانے کو تیار۔ میرے پاس گولی صرف ایک تھی۔ ایک کو مارتا ہوں تو دوسرا مجھے مار دے۔ میں نے ایک ترکیب کی۔ چاقو کھول کر زمین میں گاڑ دیا۔ اور ایسے حساب سے چاقو کی دھار پر فائر کیا کہ گولی دو حصّوں میں تقسیم ہو گئی اور دونوں شیر مر گئے۔

بھلا محبوب چچا کیوں پیچھے رہتے۔ کہنے لگے، تمھیں تو صرف دو ہی شیر ملے۔ مجھے چار شیروں نے گھیر لیا تھا۔ میرے پاس بھی ایک ہی کارتوس تھا۔ مجھے بنّوٹ کا داؤ یاد تھا گھما کر جو فائر کیا تو ایک ہی گولی نے چاروں کو ٹھنڈا کر دیا۔

جبّار صاحب جواب تک خاموش رہے تھے، محبوب چچا کی بات سن کر ضبط نہ کر سکے۔ کہنے لگے، "جی ہاں۔ آپ نے اس طرح ایک دفعہ ہرنوں پر بھی تو دولی چلائی تھی ——"

جبّار صاحب کے اس طرح ایک پرانی بات یاد دلانے پر ہو سکتا تھا کہ ہنسی مذاق اور لطیفوں کی جگہ آپس میں نوک جھونک شروع ہو جاتی، لیکن انوار چچا نے بات سنبھالی اور خود جبّار صاحب کو ہنسی کا نشانہ بناتے ہوئے کہنے لگے:

"سنا ہے آپ شیر سے بہت ڈرتے ہیں۔ ایک بار جب گھر ہی میں کسی نے جھوٹ موٹ کہہ دیا تھا کہ شیر آ گیا تو آپ چارپائی کے نیچے چھپ گئے تھے ——"

مگر جبّار صاحب بلا کے ظریف۔ وہ اس طرح کے حملوں سے کہاں ہار ماننے

Visit for more best books www.pdfbooksfree.pk

والے تھے۔ پینترا بدل کر بولے: "تو ن تیتا ہے کہ میں شیر سے درتا ہوں۔ لاؤ سلے تو میرے سامنے، باندھ تو اسے تھونٹے سے۔ اور دے دو میرے ہاتھ میں بندوت۔ پھر دیتھو میں اسے مارتا ہوں یا نہیں ——"

جبّار صاحب سے ان کے اپنے مخصوص لہجے میں یہ لطیفہ سن کر سب کے ہنسی کے فوارے چھوٹ گئے۔ لیکن سیّد کا قہقہہ ان میں شامل نہ ہو سکا۔ وہ اس وقت منہ ڈھکے گہری نیند سوئے ہوئے تھے۔ ان کی آنکھ صبح کو اُس وقت کھلی جب واپسی کی تیاریاں شروع ہو چکی تھیں★★★★

Visit for more best books www.pdfbooksfree.pk

بچوں کا پرانا ساتھی

ماہنامہ

پیام تعلیم

نئی دہلی ۲۵

۱۹۲۶ء سے شائع ہو رہا ہے

- دلچسپ، حیرت انگیز اور پُر اسرار کہانیاں
- سائنسی اور مذہبی معلومات
- کارٹون، لطیفے اور مزاحیہ مضامین
- تاریخ، جغرافیہ
- شہریت کے آداب

پر دل چسپ انداز میں بہترین مواد پیش کرتا ہے۔

ماہنامہ پیام تعلیم

جامعہ نگر، نئی دہلی ۲۵

or more best books www.pdfbooks